گردشِ ایام

خلیل احمد نینی تال والا

گردشِ ایام

پبلشر: ہمدرد پریس پرائیوٹ لمیٹیڈ

قیمت:=/300روپے

محترم قارئین

السلام علیکم

میری پہلی تصنیف ''شگوفہ نو'' کی زبردست پذیرائی کے بعد میں نے اپنے کالموں کا سلسلہ جو جنگ اخبار میں چھپ رہے ہیں دوسری کتاب کی شکل میں ترتیب دے کر اس کا نام ''گردش ایام'' رکھا ہے امید ہے جب تک کالموں کا سلسلہ جاری رہے گا انشاء اللہ کتاب کی شکل میں ترتیب وار شائع کرتا رہوں گا۔ اس کتاب میں بھی پچھلی کتاب کی طرح ۵۲ کالم شامل کئے گئے ہیں۔ امید ہے پسند آئیں گے ان دونوں کتابوں کی ترتیب، چھپائی اور ڈیزائن میں ہمدرد پریس کے ڈائرکٹرز جناب اسلم مرزا اور جناب سلیم مرزا صاحبان کا مکمل تعاون حاصل رہا ہے۔ میں ان دونوں صاحبان کا مشکور ہوں، میری کتاب کو خوبصورت سے خوبصورت ترین بنانے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اسی طرح میرے مضامین کی چھپائی کی تصیح (پروف ریڈنگ) میں محبّ احمد خان نے مکمل معاونت کی ہے۔ میں ان کا بھی مشکور ہوں۔

میں نے ان دونوں کتابوں کی آمدنی معذور بچوں کے ادارے ''دارالسکون'' کشمیر روڈ کراچی کے لئے وقف کردی ہے۔

خلیل احمد نینی تال والا

گردش ایام

خلیل احمد نینی تال والا

نمبر شمار	فہرست مضامین	صفحہ نمبر
1	اسپغول کچھ نہ بول	1-3
2	اخبارات، اشتہارات اور ٹی وی	4-6
3	یوم تکبیر یا یوم تقصیر	7-9
4	یہ چوتھا ستون کون ہلا رہا ہے	10-12
5	خودکشی سے خودسوزی تک	13-16
6	شرم تم کو مگر نہیں آتی	17-20
7	کوٹہ سسٹم نہیں کھوٹہ سسٹم کہیے	21-23
8	کشمیر کا حل	24-26
9	کرکٹ کا ڈراپ سین	27-29
10	وزیرخزانہ صاحب، آپ یہ غیرضروری ٹیکس ختم کریں	30-32
11	بول کارگل بول، کشمیر ہمارا ہے	33-35
12	گورنر صاحب اب زیادہ دیر نہ کیجئے	36-38
13	وزیر تعلیم کہاں ہیں	39-41
14	کرکٹ کے نئے چیئرمین کے نام کھلا خط	42-43
15	یہ ہی ہماری سارک کانفرنس تھی	44-46
16	امریکہ میں 2 ہفتے	47-49
17	جشن آزادی یا یوم غلامی	50-54
18	وزیرخزانہ صاحب! ایک نظر ادھر بھی	55-57
19	بھائی یہ ہرگز ہڑتال نہیں تھی	58-61
20	میچ فکسنگ کا ڈراپ سین	62-64
21	ہے کوئی ہے کوئی	65-67
22	پاک چین دوستی زندہ باد	68-71
23	دہشت گردی کا خاتمہ کیسے ہوگا	72-74
24	بھاری مینڈیٹ کا انجام یا نروس 99ء	75-78
25	پاکستان کے آب گزیدہ لوگ	79-82
26	چند قابل عمل تجاویز	83-85
27	جنرل صاحب! دہشت پھیلانے سے روکیں	86-88
28	گرفتاریوں کا پہلا ہفتہ	89-91
29	روٹی، کپڑا اور مکان کی داستان	92-94
30	اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے	95-97
31	ایک ڈاکٹر مہاتر محمد کا انتظار ہے	98-100
32	عوامی چارج شیٹ اور زرعی اصلاحات کی فوری ضرورت ہے	101-103
33	ہائی جیکنگ نے بھارت کو بے نقاب اور طالبان اور پاکستان کو سرخرو کر دیا	104-106
34	نوے دن کی کہانی	107-110
35	دو براعظموں کے پڑوسی ملکوں کی کہانی	111-114

نمبر شمار	فہرست مضامین	صفحہ نمبر
36	فراڈ کے نئے انداز	115-118
37	خودی کا سبق آج پھر سے یاد کریں	119-121
38	ایک اور جواہماری ٹیم کے ساتھ	122-124
39	24 گھنٹے اور 38 ڈکیتیاں	125-127
40	500 مکانات اپنے مکینوں کا کب تک انتظار کریں؟	128-130
41	شادی کے کھانوں پر پابندی ختم ہونی چاہیئے	131-133
42	لو وہ آرہے ہیں	134-136
43	دو الفاظ ''تمیں ارب''	137-139
44	آئے بھی وہ، گئے بھی وہ	140-142
45	ایک نیا موڑ	143-146
46	باقی سب خیریت ہے	147-149
47	دواسازی کی صنعت کا بحران	150-153
48	ایمنسٹی (Amnesty) اسکیم کو سادہ اور آسان بنایئے	154-156
49	بے حسی	157-159
50	ہمارا تعلیمی نظام	160-162
51	ٹیکس کلچر ضروری ہے مگر؟	163-165
52	یہ مسائل کون حل کرے گا؟	166-169

اسپغول۔ کچھ نہ بول

ہمارے ایک مخلص دوست جب کوئی زیادہ بولتا ہے جو حکومت کو ناپسند ہو تو وہ بیچ میں لقمہ دیتے ہیں کہ اسپغول کچھ نہ بول۔ آج کل ہماری صحافی برادری بھی کچھ ایسے ہی حالات کا شکار ہے کہ جس نے کچھ لکھا وہ عتاب میں آ گیا پہلے اخبار کے مالکان اس صورت حال سے گزرے۔ پھر کالم نگار اور ایڈیٹر اس کا نشانہ ہے اور اب بلاتخصیص خاردار سیاست میں کوچہ نوری کرنے والے تمام لوگ اس کا نشانہ ہیں۔ یار لوگ ابھی تک اس حکومت کو نہیں سمجھ سکے۔ جس طرح محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے اور تمام حملے کامیاب رہے اسی طرح اس حکومت نے آج تک جس جس محاذ پر اپنے تیر آزمائے وہ سب کے سب نشانے پر بیٹھے ہیں۔ البتہ صحافت پر جو تیر آزمایا گیا ہے اس کا نشانے پر بیٹھنا مشکوک لگتا ہے کہ یہ ہدف ذرا مشکل ہے۔

اتنا بڑا مینڈیٹ ملنے کے بعد چاہیئے تو یہ تھا کہ حکمران تمام محبِّ وطن سیاسی جماعتوں کو ساتھ لے کر پاکستان کی ترقی کے لئے دن رات کام کرتے اور عوام کی فلاح و بہبود پر توجہ دیتے۔ ان کے مسائل حل کرتے۔ مگر افسوس حکومت اور اپوزیشن باہم دست و گریباں ہیں۔ آنے والے جانے کی بات کرتے ہیں اور جانے والے ہمیشہ رہنے کی بات کرتے ہیں۔ عوام کی کسی کو فکر نہیں ہے اور نئے نئے محاذ کھولے جا رہے ہیں۔ وہ کون سقراط پیدا ہو گیا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ لوگوں کو الجھائے رکھو اور آسانی سے حکومت کرتے رہو۔ مگر ایسے عاقبت نااندیش لوگ ماضی سے سبق نہیں سیکھتے کہ جب عوام کے کاندھوں پر چڑھ کر تختہ اقتدار تک پہنچنے والے اپنی بداعمالیوں کے باعث تخت سے تختے پر آئے تو اس کو کاندھا دینے والے چار افراد بھی میسر نہ تھے۔

موجودہ صورت یہ ہے کہ مہنگائی نے عوام کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ حکمران سادگی کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر شاہی اخراجات سے باز نہیں آتے۔ اس وقت پورے ملک میں سخت گرمی کا موسم ہے اور ہر سال کی طرح اس سال بھی بجلی غائب ہے کہ پہلے تو صرف چند گھنٹوں کے لئے بجلی جاتی تھی۔ اب کئی کئی دن غائب رہتی ہے اور

متعلقہ محکمے کے عملہ پر کوئی اثر نہیں ہوتا جب کراچی میں بجلی کا نظام کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن کے تحت تھا۔ شاذ و نادر ہی بجلی جاتی تھی۔ بجلی کے نرخ بھی زیادہ نہ تھے بلکہ وقت پر بجلی کے بل کی ادائیگی پر ڈسکاؤنٹ ملتا تھا۔ نہ کوئی بجلی چوری ہوتی تھی۔ مگر جب سے خان واپڈا خان نے بجلی کا چارج سنبھالا ہے سرچارج پر سرچارج لگ رہا ہے۔ ہر صبح بجلی کے نئے نرخ کا اعلان ہوتا ہے اور اس پر بس نہیں فیول ایڈجسٹمنٹ چارج بھی لگ جاتا ہے خود واپڈا والے بجلی چوری کی ترغیب دیتے ہیں اور ایک اندازے کے مطابق 40% بجلی چوری ہوتی ہے اور اس کا سبب صرف بجلی کی مہنگائی ہے تو کیوں نہ اس کا فائدہ عوام کو دیا جائے اور بجلی کے نرخ 40% کم کر دیئے جائیں یا پھر بجلی کا نظام پہلے کی طرح مقامی کارپوریشنوں کے حوالے کر دیا جائے اور مرکز کا تسلط ختم کر دیا جائے یا دیگر ممالک کی طرح اس کو پرائیویٹائیز کر کے عوام کے حوالے کر دیا جائے۔ جس طرح ٹیلی فون کی جگہ اب موبائل کمپنیاں وجود میں آ چکی ہیں اور ٹیلی فون کا مسئلہ ختم ہو گیا ہے اس طرح بجلی کا مصنوعی بحران بھی ختم ہو سکتا ہے۔ مجھے تو اس وقت تعجب ہوا جب ہمارے گورنر سندھ نے ایک تقریب میں انکشاف کیا کہ میں بھی اس سے دوچار رہتا ہوں اور جب کبھی بجلی چلی جاتی ہے تو میں باہر لان میں آ بیٹھتا ہوں۔ حضور آپ کا لان تو گالف کے میدان سے بھی بڑا ہے۔ آپ کو کیا فرق پڑے گا۔ ایک عام آدمی سے تو پوچھیئے کہ اس پر کیا گزرتی ہے جب وہ رات رات بھر جاگتا ہے اور صبح مزدوری پر جانا ہوتا ہے' کس طرح وہ اپنے دفتر میں کام کرے گا۔ گورنر صاحب کے اس جملہ سے بجلی کے عملہ کی سرزنش کے بجائے ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے' ایک مرتبہ میں سوات گیا۔ مینگورہ میں دن میں کئی کئی بار بجلی جاتی تھی تنگ آ کر ایک دن شہریوں نے واپڈا کا گھیراؤ کر لیا اور اس وقت تک اپنا دھرنا ختم نہیں کیا جب تک واپڈا والوں نے ان کے نمائندہ کو یہ لکھ کر نہیں دیا کہ اب بجلی صرف ایک بار دو گھنٹے کے لئے جائے کی کیونکہ بغیر اس بریک کے وہ بجلی مسلسل سپلائی نہیں کر سکتے۔ اور وہی ہوا کہ میں تقریباً دو ہفتے وہاں رہا صرف دو گھنٹے کے لئے دن میں صرف ایک بار وہ بھی شام پانچ بجے سے سات بجے تک جاتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر عملہ چاہے تو بجلی نہ جائے۔ اس پر سختی کی ضرورت ہے۔ کہاں گئے وہ دعویدار جو کہتے تھے کہ ہم بجلی ایکسپورٹ کر سکتے ہیں اور کہاں گئے وہ لوگ جو کہتے تھے اگلے سال بجلی کی لوڈشیڈنگ نہیں ہوگی۔ کیا آج تک کسی کو اس کی سزا ملی ہے۔ یا کسی کی تنزلی ہوئی ہے؟ کہ یہ لوڈشیڈنگ کیوں بند نہیں ہو سکتی۔ صرف چند ذمہ دار لوگوں کو نوکری سے نکال دیں پھر دیکھیں کیسے بجلی جاتی ہے۔ یہی پانی کا حال ہے۔ بلدیہ پانی کا ٹیکس بڑھا چڑھا کر وصول کر لیتی ہے مگر کئی کئی دن پانی کا ناغہ رہتا ہے۔ لائن مین سے آپ خصوصی تعلقات رکھیں آپ کے گھر کے باہر پانی بہتا رہے گا اور دیگر علاقوں میں لوگ بوند بوند کو ترستے ملیں

گے۔ کیا کسی نے ان کا محاسبہ کیا ہے۔ کم از کم گورنر راج میں تو یہ سہولتیں واپس مل جائیں ورنہ پھر اس راج کا کیا فائدہ؟ آخر میں اس سازش کی نشاندہی کرونگا جو اس ملک کی معیشت کو ختم کرنے کے لئے ہو رہی ہے۔ وہ ہے بینکوں کی لاکھوں نہیں کروڑوں روپے کی بارش۔ یہ اسی طرح کی بارش ہے جس طرح فنانس کمپنیاں چند سال قبل عوام کو دھوکہ دے کر غائب ہو گئیں۔ اگرچہ یہ بینک ایسا تو نہیں کریں گے مگر لوگ تجارت میں پیسہ لگانے کے بجائے ان بینکوں میں فکسڈ ڈپازٹ کرائیں گے۔ اس کے بعد نئے نئے بینک آگے بڑھیں گے۔ وہ اس سے بھی بڑھ کر انعامات کی بارش کریں گے پھر راتوں رات یہ بینک بند ہو جائیں گے اور پھر عوام ایک نئے ماتم کا بندوبست کریں گے لہٰذا یہ اسکیمیں فوری طور پر بند کی جائیں ورنہ اس کے برے اثرات جلد ہی رونما ہوں گے۔ جو دیہات قصبوں اور گاؤں سے نکل کر بڑے بڑے شہروں تک کی منڈیاں ختم کر دیں گے۔

اخبارات، اشتہارات اور ٹی وی

ہم پاکستانی چند ماہ بعد ایک نئی صدی میں داخل ہونے والے ہیں اور اسی مناسبت سے آج کل ہمارے اخبارات ٹیلی ویژن ہم کو لاتعداد کاریں اور دیگر قیمتی انعامات سے نوازنے اور کروڑ پتی بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ پہلے زمانے میں لوگ اخبارات خبریں پڑھنے کے لئے خریدتے تھے اور ان اخبارات میں چند اشتہار ہوتے تھے تو بھائی لوگ ان اشتہارات کو برداشت بھی کرتے تھے اور ان اشیاء کی خریداری بھی کرتے تھے۔ مگر آج اخبارات میں خبریں کم اور اشتہارات زیادہ ہوگئے ہیں۔ لہٰذا مرد حضرات تو جلد ہی اخبارات پڑھ کر فارغ ہوجاتے ہیں البتہ ہماری خواتین ان انعامی اشتہارات کو پڑھ کر نہ صرف خوش ہوتی ہیں بلکہ اپنی پڑوسن سے مشورہ بھی کرتی ہیں کہ بہن کس کس بینک میں روپیہ لگاؤں اور کون کون سرٹیفکٹ خریدوں کہ میں راتوں رات کروڑ پتی بن جاؤں یا میری بھی ایک گاڑی تو نکل ہی آئے۔ کون بسوں اور رکشوں میں دھکے کھاتا پھرے۔ اب تو میدان میں اتنے انعامات کی بھرمار ہوچکی ہے کہ بغیر انعام کے کوئی بھی چیز خریدنے کو دل نہیں کرتا۔ اگر ایک بینک لکھ پتی بنا رہا ہے تو دوسرے دن دوسرا بینک کروڑ پتی بنانے پر تلا نظر آتا ہے۔ ادھار روپیہ لینا ہو تو محسوس ہوتا ہے گویا اب نوٹ اسی بینک میں چھپ رہے ہیں اور بینک کا افسر اپنی دراز میں کروڑوں روپے رکھے آپ کا انتظار کر رہا ہے کہ جیسے ہی آپ بینک میں داخل ہوں اور وہ کہے، کتنے لاکھ چاہئیں پھر آپ کے بولنے سے پہلے وہ گنے ہوئے نوٹ آپ کو پکڑا دے اور آپ کہ گاڑی اسٹارٹ چھوڑ کر آئے تھے واپس پہنچیں تو گاڑی میں بیٹھی بیگم گھبرا کر پوچھیں۔ ''کیا آج بینک بند تھا جو آپ اتنی جلدی واپس آگئے۔'' تو آپ مسکرا کر بیگم کی طرف دیکھیں گے اور کہیں گے کہ یہ لو بیگم سنبھالو اپنی رقم اب تو ہمارا نام ہی کافی ہے۔ دوسری طرف گاڑیوں اور ٹی وی، ریفریجریٹروں، موٹر سائیکلوں کی لائن لگی ہوئی ہے۔ اگر آپ یہ خریدیں تو یہ انعامات آپ کے منتظر ہیں۔ اشتہارات دیکھ دیکھ کر جوش بڑھ رہا ہے اور پوری قوم اس میں لگ گئی ہے اگر تین کمروں کا فلیٹ

لیں تو چوتھا کمرہ مفت ملے گا۔ آدھا پاکستان 50% سیل پر لگا ہوا ہے کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ بھائی یہ کیسی سیل ہے جو تم پچاس فیصد تک کم کرنے پر آمادہ ہو۔ اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو پہلے پچاس فیصد دام بڑھا لئے جاتے ہیں اور پھر قیمتوں کی چٹوں پر آدھی رقم لکھ دی جاتی ہے اب تو ہوٹلوں میں بھی مقابلہ (Competition) شروع ہوگیا ہے دو آدمیوں کے کھانے کے آرڈر پر تیسرا آدمی مفت کھا سکتا ہے۔ اسی طرح فاسٹ فوڈز کے نئے نئے انعامی اشتہارات آنے لگے ہیں۔ مثلاً بڑے برگر پر چھوٹا برگر مفت۔ یا ایک برگر آپ خریدیں تو دوسرا برگر مفت آپ کا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح چار مرغی کی ٹانگوں کی خرید پر دو ٹانگیں بالکل مفت ملیں گی۔ چاہے گھر میں کھانے کو نہیں ہے۔ مگر اسی برگر اور مفت ٹانگوں کے لئے سب ہی لائنوں میں لگے ہوئے ہیں۔ پہلے ایک ٹوتھ پیسٹ خریدنے پر برش مفت ملتا تھا مگر آج کل ایک برش خریدنے پر دو ٹوتھ پیسٹ مفت مل رہے ہیں۔

خبروں کی کسی کو پرواہ نہیں ہے، انعامات اور اشتہارات کے ذریعے پوری قوم کو جوئے میں لگا دیا ہے۔ اگر ہمارے کھلاڑی جوا کھیلیں تو پوری قوم ان پر لعنت ملامت کرتی ہے کہ پیسوں کی خاطر جوا کھیلا اور ملک کا وقار داؤ پر لگا دیا ہے جبکہ یہ انعامات کیا ہیں؟ کوئی اپنی جیب سے دے رہا ہے؟ آپ سے گیارہ فیصد سود پر روپیہ لے کر 23 سے 33 فیصد تک آپ ہی کے بھائی بندوں کو دیا جا رہا ہے۔ انہی رقوم سے کروڑوں روپے کی نقد انعامات، کاریں اور دیگر چیزوں کے لالچ میں پھنسایا جا رہا ہے۔ لوگ اب تجارت میں روپیہ لگانے کے بجائے ان لاٹریوں میں اپنا سرمایہ لگا رہے ہیں۔ یہ اسلامی ملک کی شان ہے جہاں کوئی بھی اس پر اعتراض کرنے والا نہیں ہے۔ اب نئی صنعتیں کہاں لگیں گی اور کون لگائے گا۔ جب تمام سرمایہ ان لاٹریوں کی نذر ہوجائے گا۔ اگر قوم کو ان انعامات کی لت پڑ گئی تو کوئی بھی چیز بغیر انعامات کے نہیں بک سکے گی۔ دوسری طرف ہمارا ٹیلی ویژن بھی ان اشتہارات سے بھرا پڑا ہے۔ آج کل پوری قوم مجھ سمیت کرکٹ میں لگی ہوئی ہے ایک ایک اوور کے بعد پہلے صرف ایک اشتہار ہوتا تھا اب اوور چھ گیندوں کا ہوتا ہے جبکہ اشتہارات دس دس ہوتے ہیں۔ لگتا ہے ہر اوور کے ساتھ چار چار نو بولیں یا وائڈ بولیں ہو رہی ہیں اور ان میں بھی انعامات کی بھرمار ہے۔ جو کرکٹ کے شائقین ہیں وہ بور ہو رہے ہیں جو انعامات جیتنے کی فکر میں ہیں وہ ٹی وی کے سامنے سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور ان 45 دنوں میں ہمارا ٹی وی سارے سال کی کمائی کرنے کی فکر میں ہے۔ اس کو شائقین کی فکر نہیں ہے کہ وہ ان اشتہارات سے کتنے جھنجلاتے ہیں۔ خاص طور پر جب کوئی ہمارا کھلاڑی آؤٹ ہوجائے یا آؤٹ کرے تو فوراً دس بارہ اشتہارات دکھلا کر موڈ خراب اور مزہ کرکرا کر دیا جاتا ہے۔ ارباب اختیار ان سے

یہ نہیں پوچھتے کہ تم کرکٹ کا میچ دکھا رہے ہو یا اشتہارات۔ جن لوگوں کے پاس ڈش انٹینا ہے وہ غیر ممالک کے چینل سے ہی میچ دیکھنا پسند کرتے ہیں کیونکہ وہاں اشتہارات کی بھرمار نہیں ہوتی دو چار اوور کے بعد ایک آدھ اشتہار ہوتا ہے جو قابل برداشت بھی ہے اور اس اشتہار کا اثر بھی ہوتا ہے مگر ہمارے ٹی وی سے ایک صابن کے بعد دوسرے صابن کا اشتہار دونوں کا اثر زائل کر دیتا ہے کیونکہ دیکھنے والے اس سے متاثر ہونے کے بجائے بور ہوتے ہیں۔ ہمارے ٹی وی پر اب صرف چند اچھے ڈرامے رہ گئے ہیں جن کو لوگ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ورنہ دوسرے غیر ملکی چینل سے ہی لطف اندوز ہونا پسند کرتے ہیں۔ حتی کہ وہ ہمارے دشمن ملک کا خبرنامہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے خبرنامے میں خبروں کے علاوہ ہر چیز ہوتی ہے۔ پہلے دس منٹ قوم کو حکومت کے کارناموں سے آگاہ کیا جاتا ہے' یہ کارنامے عموماً خبرنامے تک ہی محدود ہوتے ہیں پھر کشمیر کی سیر ضرور کرائی جاتی ہے۔ دنیا میں کہیں سیلاب آتش فشاں کے پھٹ پڑنے' جہاز کے تباہ ہونے جیسی اطلاعات فراہم کی جاتی ہیں۔ آخر میں تجارتی خبریں جن میں روپے کی قیمت میں کمی کی خبر لازمی ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں تجارت میں جو کمی ہو رہی ہے اس پر تبصرہ ہوتا ہے پھر کھیل کی خبریں اور یوں خبرنامہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ جن کے پاس ڈش انٹینا نہیں وہ بیچارا مجبوراً خبرنامہ دیکھتا سنتا اور سر دھنتا ہے۔ ہر روز خبرنامے سے جو تاثر ابھرتا ہے وہ یہ کہ وطن عزیز میں ہر طرف سب خیر ہی خیر ہے۔ تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ہمارے ٹی وی کو جھنگ کے سانحہ کی خبر تو نہیں ملتی البتہ سات سمندر پار کسی گاؤں میں کوئی حادثہ ہو گیا تو ہمارا ٹی وی اس کی خبر بھی دیتا ہے اور فلم بھی دکھاتا ہے اب کون سمجھائے ان ٹی وی والوں کو کیونکہ ان پر بھاری مینڈیٹ سوار ہے۔

یوم تکبیر یا یوم تقصیر

ہم نے ایک سال قبل ایٹمی دھماکہ کر کے اپنے ازلی دشمن بھارت کو جتا دیا تھا کہ وہ اس گھمنڈ میں نہ رہے کہ پاکستان اس کا تر نوالہ ہے اور وہ جب چاہے گا کشمیر کو ہضم کر لے گا۔ مگر اس دھماکے کے بعد قوم پر مسلسل دھماکے ہوتے رہے۔ مثلاً سب سے پہلے قوم کے اعتماد پر دھماکہ کیا۔ یعنی اسی رات فارن کرنسی اکاؤنٹ منجمد کر دیئے گئے۔ ہر طرف سے اس کے خلاف واویلا ہوا مگر اس وقت کے وزیر خزانہ سرتاج عزیز صاحب نے کسی کی ایک نہ سنی۔ اسی کی آڑ میں حکومت کے بڑوں نے اپنے اپنے اکاؤنٹ کے ڈالر راتوں رات غیر ممالک منتقل کروالئے اور قوم کے ڈالر منجمد کر ڈالے اس طرح جو ڈالر مارکیٹ میں 44 روپے کا تھا ایک رات میں بڑھ کر 52 روپے کا ہو گیا اور اسی پر بس نہیں ہوا' فارن کرنسی اکاؤنٹ منجمد کرنے سے عوام کا اعتماد مجروح ہوا اور ہمارے روپے کی قیمت روز بروز کم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ مارکیٹ میں ڈالر 62 روپے تک پہنچ گیا اور حکومت نے اس پر مرہم لگانے کے بجائے نمک چھڑک کر اعلان کیا کہ ڈالر کے بدلے 46 روپے ملیں گے۔ اس سے عوام کی حب الوطنی پر بھی ضرب لگا دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ہمارے وزیر اعظم نواز شریف صاحب نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان کی بقا کے نام پر فنڈ مانگا تو قوم نے اس کا مثبت جواب نہیں دیا اور اس وزیر اعظم فنڈ میں کروڑوں روپے اخبارات اور ٹی وی کی اشتہاری مہم پر خرچ کی ہوئی رقم کے برابر بھی فنڈ اکٹھا نہیں ہو سکا۔ اس کے برعکس بھارت نے نہ صرف یہ کہ فارن کرنسی اکاؤنٹ منجمد نہیں کئے بلکہ ڈالر سرٹیفکٹ جاری کئے اور لوگوں نے ایک دن میں مطلوبہ رقم سے چار گنا رقم کے ڈالر سرٹیفکٹ خریدے اور ہمارے عوام نے جو اسلام اور پاکستان کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے بھی ہر وقت تیار رہتے تھے' اسی حکومت کے دیئے ہوئے مینڈیٹ کے خلاف پہلی بغاوت کر دی اور وزیر اعظم فنڈ کی' پھیلائی ہوئی جھولی خالی کی خالی رہی۔ مگر حکمرانوں نے اسی پر بس نہیں کیا۔ پیٹرول' بجلی اور گیس کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا گیا جبکہ دنیا

میں پیٹرول کے نرخ گر رہے تھے۔ وطن عزیز میں پیٹرول کے نرخوں میں وقتاً فوقتاً اضافہ کر دیا جانا اب ایک روایت بن گئی ہے۔ ہر مرتبہ اضافے کے ساتھ وزیر خزانہ صاحب یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ اس سے عوام پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ گویا کہ یہ اضافہ عوام کے بجائے فرشتے برداشت کریں گے۔ میں نے اس وقت بھی لکھا تھا کہ ایک طرف تو آپ ان بنیادی اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کر دیتے ہیں اور پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ عوام پر اس کا اثر نہیں ہوگا۔ یہ دلیل سمجھ میں نہ آنے والی ہے۔

بھلا تاجر اور صنعتکار اشیاء کی تیاری پر پڑنے والے اس بوجھ کو خود کیونکر برداشت کریں گے۔ پھر وہی ہوا دوسرے ہی دن عام اشیاء کی قیمتیں بڑھ گئیں۔ حتیٰ کہ ڈالر بھی مارکیٹ سے غائب ہو گیا۔ اس سے حکومت کی سبکی ہوئی اور ہمارے وزیر خزانہ کو ہٹا کر انہیں وزیر خارجہ لگا دیا گیا۔ یعنی جو شخص اپنی قوم کو ہی نہیں سمجھ سکا اسے تمام دنیا کو سمجھانے پر لگا دیا گیا۔ ایسی ہی حماقتیں ہیں جن کی وجہ سے ہماری سیاسی ساکھ آج تک نہیں سنبھل سکی۔ ہم دنیا کو دکھانے کے لئے کہتے کچھ ہیں اور عملاً اس کے خلاف کرتے ہیں۔ ہمارے اپنے کتنے دوست ممالک ہم سے شاکی ہیں۔ چین جیسا دوست، جس نے ایٹمی صلاحیت کے حصول میں ہماری بھرپور مدد کی، آج وہ بھی خاموش ہے۔ بھارت جب چاہتا ہے۔ ہمیں دھمکی دے کر کشمیر کو اپنا حصہ بتاتا ہے، اب تو ہم سلامتی کونسل میں بھی اس کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے۔

بہرحال اسی کشمکش میں ایٹمی دھماکے کو ایک سال ہوا چاہتا تھا کہ حکومت نے دھماکہ کو کیش کرانے کے لئے ''یوم تکبیر'' کا اعلان کر دیا۔ یعنی یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ صرف اسی حکومت کی بدولت ہم نے ایٹمی دھماکہ کیا اور ماضی کی تمام حکومتوں کی کوششوں کو نظر انداز کر کے تمام کریڈٹ اپنے حصے میں ڈال لیا اور بغلیں بجانا شروع کر دیں۔ پھر حکومتی سطح پر ایک جشن کی تیاریاں شروع کی گئیں۔ ٹی وی کو تو اپنا حق ادا کرنا ہی تھا۔ ہر پروگرام کے بعد اس ''یوم تکبیر'' پر کہ جو عوام کے لئے ''یوم تقصیر'' بنا ہوا تھا ایک اور دھماکہ ہوا یعنی ایک مرتبہ پھر پیٹرول کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا گیا۔ حکومت یہ اعلان کرتی تھی کہ ہم بجلی، گیس اور پیٹرول کی قیمتوں میں اضافہ نہیں کریں گے مگر ستم ظریفی دیکھئے کہ ابھی بجٹ اپنے آخری مراحل میں تھا کہ ''یوم تکبیر'' کی آڑ لے کر قوم کی گردن پر چھری پھیر دی گئی اور پیٹرول اور اس سے متعلقہ اشیاء پر راتوں رات تقریباً دس فیصد اضافہ کر دیا گیا اور اب حکومت کا وہی روایتی اعلان آئے گا، پیٹرول کی قیمتوں میں اضافے کا عوام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ کیونکہ عوام تو پیٹرول نہیں پیتے ہاں صرف بسیں، گاڑیاں، رکشے اور ٹرکوں کے کرائے بڑھ جائیں گے اور ان سواریوں پر عوام نہیں فرشتے سفر کریں گے۔ قوم اسی طرح قربانی دیتی رہے گی۔ ہم اپنے شاہی اخراجات کم نہیں کریں

گے۔ ہمارے غیر ملکی دورے صرف دوستوں کو نوازنے کے لئے ہوں گے۔ ہم جہاز بھر بھر کر لے جائیں گے اور خالی ہاتھ واپس آ جائیں گے اور اعلان ہوگا کہ وزیر اعظم کا دورہ بڑا کامیاب رہا ہے کیا آج تک ہماری وزارت خارجہ نے کبھی کسی دور میں اعلان کیا ہے کہ ہمارے صدر یا وزیر اعظم کا دورہ ناکام ہوا ہے؟ خدارا ''یوم تکبیر'' پر قوم کے ساتھ یہ مذاق بند کریں۔ عوام پر ٹیکس لگانے کے بجائے ان کے مسائل حل کریں کیونکہ قوم اس وقت ڈپریشن کا شکار ہے۔ وہ ایٹمی دھماکہ کی آڑ میں بہت کچھ برداشت کر چکی ہے۔ اب اس کے اعصاب جواب دے رہے ہیں۔ اس کا مزید امتحان نہ لیجئے۔ اگر لاوا پھٹ پڑا تو نہ جانے کون کون اس کی زد میں آئے گا۔ قوم اب حساب لینے کے موڈ میں ہے۔ کیا اس کی تیاری کر لی ہے کیونکہ بقول شاعر قوم دیکھ رہی ہے کہ

ہر شخص بنا لیتا ہے اخلاق کا معیار
اپنے لئے کچھ اور، زمانے کے لئے اور

یہ چوتھا ستون کون ہلا رہا ہے

جب سے چند افراد جن کا تعلق صحافت سے تھا سرد و گرم لکھنے کی پاداش میں گرفتار ہوئے ہیں۔ صحافت کی نئی نئی ڈکشنریاں چھپنے لگی ہیں اور ہر شخص اپنے اپنے انداز میں صحافت' کالم نگاری' اخبار نویسی کے معنی نکالنے لگا ہے۔ اس دوڑ میں خود حکومت یا اس کے چاہنے والے سب سے آگے ہیں۔ دوسری طرف ان کا مقابلہ حزب اختلاف اور اس کے چاہنے والوں سے ہے۔ تیسری طرف وہ سینئر صحافی' کالم نویس' اخبار مالکان جنہوں نے اپنی تمام زندگی اس پودے کو درخت بنانے میں صرف کی اور کبھی اپنے قلم کو بکنے تو کجا' ہلنے بھی نہیں دیا۔ چھوٹی موٹی تنخواہ اور اپنے اصولوں پر زندگی گزار دی۔ آج راتوں رات امیر بن جانے والے صحافیوں' کالم نگاروں اور مالکوں کو دیکھ کر کف افسوس ملتے ہیں کیونکہ ساری زندگی نہ تو اخبار کے مالک کے سامنے جھکے اور نہ ہی حکمرانوں کے آگے پیچھے چلے۔ جو حق کی بات تھی وہ لکھ دی اور بس۔

جب ہوا نے رخ بدلنا شروع کیا تو ہمارے صحافیوں نے جن میں بڑی تعداد اس خارزار میں پہلا پہلا قدم رکھنے والوں کی تھی' ان تھپیڑوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے ان کے رخ پر چلنا بلکہ اڑنا شروع کر دیا۔ اور پھر صحافت میں خوشامد' چمک'' عہدے' پلاٹ اور پرمٹ شامل ہوتے چلے گئے یوں صحافت بھی ایک طرح کی ہلکی پھلکی تجارت بن گئی۔ بڑھتے بڑھتے یہ تجارت' صنعت اور وزارت تک جا پہنچی۔ چونکہ میں تیس سال سیاست میں رہا اس وجہ سے میں نے اس کو بہت قریب سے دیکھا۔ پہلے کاغذ بکا پھر پینسل بکی اور اب کھلے عام قلم بکتا ہے۔ الا ماشاء اللہ اب چند اصول پسند صحافی اور کالم نویس ایسے جو قلم کی حرمت بچائے ہوئے ہیں۔ پھر ذرا سوچئے تو اس ملک اور قوم کا کیا بنے گا اب تو اس ملک میں ہر چیز برائے فروخت ہو کر رہ گئی ہے۔ پہلے اخبار خبروں سے بکتے تھے اور اخبار مالکان انہی کی آمدنی سے صحافیوں' اخبار نویس' کالم نگاروں' کاتبوں اور چپراسیوں کو تنخواہیں ادا کرنے اور دیگر اخراجات نکالنے کے بعد اپنے بال بچوں کے لئے بھی بچا لیا کرتے

تھے۔ مگر اب بھلا کوئی اخبار بغیر اشتہار کے نکل اور چل سکتا ہے؟ نتیجہ کیا ہوا خبریں کم سے کم اور اشتہارات زیادہ سے زیادہ ہوتے گئے۔ لوگ باگ خبریں پڑھنے کے بجائے کالم پڑھنے لگے کیونکہ اس میں بے لاگ تبصرہ ہوتا تھا' نئے نئے کالم نگار آتے گئے اور لکھتے گئے۔ اس میں سیاست داں' ریٹائرڈ فوجی' بیوروکریٹس' سرکاری ملازمین' صنعت کار کھلاڑی سب ہی شامل تھے۔ انہوں نے اپنی اپنی بساط کے مطابق لکھنا شروع کیا۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس لئے جب قلم کے محافظوں نے (چند ایک کو چھوڑ کر) اسی قلم کی عظمت بھلا دی تو ان بے لوث افراد نے ان کی جگہ فرض ادا کرنا شروع کر دیا۔ اس سے ان کی سبکی ہوئی تو کسی نے انہیں شہرت پسند تو کسی نے شوقیہ لکھنے والوں کا حوالہ دیا کسی نے کوئی پھبتی تو کسی حکومتی منچلے نے کسی اور انداز سے نوازا کہ یہ اخبار نویس یا صحافی نہیں ہو سکتے۔ حقیقی صحافت کی تعریف یہ ہے کہ جس نے اپنے قلم سے سچ لکھا اور وہ جب تک اس کو نبھاتا رہا وہی صحافی ہے جس دن اس نے قلم بیچ دیا تو وہ صحافی نہیں رہا اپنے ضمیر کا سوداگر بن گیا اور جو اپنا ضمیر بیچ دے اسے ملک کا سودا کرنے میں بھی کوئی عار نہیں ہو سکتا۔ ایسا صحافی' صحافی نہیں بے ضمیر تاجر ہے اور یہ کام کوئی بھی صحافی کر سکتا ہے۔ اس میں سینئر یا جونیئر کا دخل نہیں ہے۔ اب نفسانفسی کا دور ہے طور طریقے بدل رہے ہیں اقدار بدل رہی ہیں پہلے زمانے میں اخبار کے مالکان کا ایک دبدبہ اور وقار ہوتا تھا اور شرافت ہی اس کا طرہ امتیاز ہوتی تھی مگر جب سے صحافت کو آزادی ملی' گلی گلی اخبارات نکلنے شروع ہو گئے۔ صحافی مالکان بننے لگے تو اب صحافی کون بنے۔ نتیجہ یہ کہ ہر ایک نے بلا امتیاز اس میدان میں کودنا شروع کر دیا۔ اخبارات سیل ہونے لگے تو مالکان نے انہی نام نہاد صحافیوں کی بدولت صنعت کاروں' حکومتوں' سیاستدانوں' سرکاری ملازموں' بیوروکریٹس کے گرد حلقہ تنگ کرنا شروع کر دیا اور ان کی معمول کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی خبریں جلی سرخیوں کے ساتھ شائع کر کے صحافت کو بدنام کرنا شروع کر دیا اور اب بلیک میلنگ کے ذریعے مال بنانا ایک معمول بن کر رہ گیا ہے اگر کسی تھانیدار نے کسی صحافی کی خواہش پوری نہیں کی تو دوسرے دن اس کے خلاف خبر لگا دی اور چٹ پٹی خبروں کا یہ سلسلہ کئی کئی دن تک جاری رہا۔ اگر کسی صنعت کار نے اس کے من پسند آدمی کو ملازم نہیں رکھا یا اس کو اشتہار نہیں دیا تو دوسرے دن اس پر قیامت ٹوٹ پڑے گی اور کئی کئی دن تک اس کے خلاف خبریں لگتی رہیں گی حتیٰ کہ اس کو مک مکا کرنا پڑے گا اس سے زیادہ بری درگت اور اس صحافت کی کیا بنے گی۔ ہمارے ایک مخلص صحافی دوست تو برسوں ایک پریس کلب کی سالانہ ممبر فیس اپنی جیب سے جمع کروا کر الیکشن میں ووٹ ڈلواتے انہی صحافی حضرات کو بلاتے اور الیکشن جتنا کرتے تھے تاکہ ان صحافیوں کی جیب پر اس کا بوجھ نہیں پڑے چونکہ یہ مقابلے کا دور ہے نہ جانے ہمارے ملک کی صحافت اور کتنی دور جائے گی۔ یہ ایک معزز

پیشہ تھا مگر افسوس حالات نے اس کو معزز نہیں رہنے دیا اور صرف پیشہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اللہ اس سے ملک اور قوم کو بچائے۔ جو ہمارے اسلاف نے کیا اس کا پھل ہم کھا رہے ہیں لہٰذا ہمیں سوچنا چاہئے کہ ہماری آنے والی نسل ہمارے بوئے ہوئے بیج کا پھل کھا کر ہم کو کن لفظوں سے یاد کرے گی۔

یہ کون ہے جو ریاست کے چوتھے ستون کو ہلا رہا ہے؟ ریاست کے حکمرانوں اور محافظوں کو اس کی فکر کرنا چاہئے۔

خودکشی سے خودسوزی تک

دنیا میں سب سے زیادہ خودکشی کرنے کا رواج جاپان میں پایا جاتا ہے اس کے بعد کوریا اور پھر دوسرے ممالک ہیں۔ مگر یہ بات طے ہے کہ دنیا کا کوئی ملک خودکشی کرنے والوں سے پاک نہیں ہے۔ جاپان میں خودکشیوں کی عجیب وغریب داستانیں رقوم ہیں اور سب سے زیادہ خودکشیاں ذاتی ناکامی کی وجہ سے کی جاتی تھیں اور آج بھی ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً پہلے جاپان میں فلم اسٹار جب بوڑھی ہونے لگتی تھی یا اس پر کسی جونیئر فلم اسٹار کو ترجیح دی جاتی تھی تو وہ دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لیتی تھی۔ اس کو برا نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اس کو ''عزت کی موت'' سمجھا جاتا تھا۔ بڑے بڑے فلم ساز' اوپر تلے اپنی فلموں کے فلاپ ہو جانے کے باعث خودکشی کر لیتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی خودکشی کے بہت سے اسباب ہوتے تھے اور اس کا تعلق عمر سے بھی ہوتا تھا۔ مثلاً بڑے بڑے صنعت کار جب خسارے سے دوچار ہوتے تھے تو انا کے ہاتھوں موت کو گلے لگا لیتے تھے اسی طرح فوج میں اگر کوئی بڑا عہدیدار کوئی بہت بڑی غلطی کر لیتا تھا تو وہ شرمندگی کا سامنا کرنے کے بجائے موت کو گلے لگا لینا بہتر سمجھتا تھا یا پھر کوئی فوجی کسی مشن میں ناکام ہو جاتا تھا تو وہ واپس آنے کے بجائے خودکشی کر لیتا تھا دوسری جنگ عظیم میں جب جاپان نے ہتھیار ڈالے تو سینکڑوں فوجیوں نے ہتھیار ڈالنے پر موت کو ترجیح دی اور خود کو ختم کر لیا کیونکہ جاپانی سب سے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ دنیا بھر میں غربت' بھوک اور افلاس سے مرنے والوں کی تعداد علاوہ ایشیاء کے نہ ہونے کے برابر ہے۔ کیونکہ تمام ترقی پذیر ممالک مہنگائی اور بیروزگاری الاؤنس دیتے ہیں۔ اس لئے یورپ' امریکہ' آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ میں غربت سے مجبور ہو کر کوئی خودکشی نہیں کرتا۔ بلکہ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ ہر عمر کے الگ الگ مسائل ہوتے ہیں اور لوگ اسی کی وجہ سے خودکشی کرتے ہیں۔ مثلاً نوجوان عشق میں ناکامی پر یا بیوی یا محبوبہ کی بے وفائی پر اپنے جذبات کو قابو میں نہیں رکھ پاتے اور جان دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کسی شخص کے اقدام خودکشی پر پولیس اس کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے

اور اگر وہ بچ جائے تو اس کے خلاف پرچہ درج نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی وجہ جاننے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کا حل نکالا جاتا ہے تاکہ آئندہ وہ اپنی جان اپنے ہی ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈال سکے اس کی اخلاقی اور قانونی مدد کی جاتی ہے۔ اس کو معاشرہ کا اہم فرد سمجھا جاتا ہے کیونکہ یورپ اور امریکہ میں انسان کی جان سے بڑھ کر قابل احترام کوئی اور چیز نہیں اور اب تو وہ حیوانوں کو بھی اسی زمرہ میں لاتے ہیں۔ کسی بھی بے زبان کے ساتھ زیادتی وہاں ہرگز برداشت نہیں کی جاتی۔ خواہ وہ ان کے گھر کا کتا یا بلی ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے ادارے موجود ہیں جو ان جانوروں کی حفاظت کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اگر ان حیوانوں پر کوئی ظلم ہو تو اس کے خلاف نہ صرف آواز بلند کی جاتی ہے بلکہ بڑے بڑے مظاہرے بھی کئے جاتے ہیں۔ نوجوانوں کے احساسات سے کوئی کھیلے تو وہ برداشت نہیں کرتے اور فوراً جذباتی ہو کر خودکشی کر بیٹھتے ہیں۔ امتحانات میں ناکام طالب علم بھی اپنے ساتھیوں کے سامنے شرمندگی اٹھانے پر خودکشی کو فوقیت دیتا ہے۔ ماں باپ کی طرف سے نظرانداز کئے جانے والے بچے بھی احساس کمتری میں مبتلا ہو کر خودکشی کر لیتے ہیں اس کے لئے بھی یورپ میں بڑے سخت قوانین ہیں اور بہت سے ادارے چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے گھروں میں جا کر معلوم کرتے ہیں کہ ان کے والدین ان کو نظر انداز، سختی یا مار پیٹ تو نہیں کرتے۔ یہ بھی قانوناً جرم ہے کیونکہ اس سے بچہ آگے چل کر احساس کمتری کا شکار ہو کر بعض اوقات یا تو خودکشی کر لیتا ہے یا پھر کوئی سنگین جرم کر بیٹھتا ہے۔ اس کی زندہ مثال ایک ماہ قبل امریکہ کے ایک اسکول میں پیش آنے والا واقعہ ہے، اس طرح کہ کچھ بچے جو پڑھائی میں کمزور تھے اور غلط عادتوں کی وجہ سے دوسرے بچوں میں اچھے نہیں سمجھے جاتے تھے۔ ان میں سے چار نے مل کر اسی احساس کمتری کو چھپانے کے لئے اپنے ہی ساتھیوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ جس سے کئی بچے ہلاک ہو گئے جبکہ بچوں کو بچانے کی کوشش میں ایک استاد بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا اور جب پولیس نے اسکول کو گھیرے میں لیا تو انہوں نے پولیس کے بار بار کے اعلانات پر کوئی توجہ نہیں دی اور گرفتاری دینے کے بجائے خودکشی کر لی۔

دوسرے نمبر پر خودکشی کرنے والے بڑی عمر کے لوگ ہوتے ہیں وہ یا تو کسی مالی نقصان کی وجہ سے خودکشی کرتے ہیں یا پھر لمبی بیماری سے تنگ آ کر اپنے آپ کو ہلاک کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایڈز، سرطان یا بڑھاپا جو اتنا بڑھ جاتا ہے کہ اٹھ بیٹھ سکتے ہیں، نہ چل پھر سکتے ہیں محتاج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ امریکہ میں تو ایک ڈاکٹر نے ایسے بہت سے مریضوں کو موت کے انجیکشن لگا دیئے جنہوں نے اس ڈاکٹر سے موت کی تمنا کی تھی۔ آج کل اس پر مقدمہ چل رہا ہے۔ مذکورہ ڈاکٹر نے اعتراف کیا کہ یہ لوگ اتنے بے بس تھے کہ اگر ان کو موت کا انجیکشن نہ لگاتا تو خودکشی کر لیتے یہ لوگ خودسکون سے مرنا چاہتے تھے کیونکہ ان کی بیماری لاعلاج تھی یا بہت طویل تھی۔ ان

کے نزدیک زندگی موت سے بدتر تھی لہٰذا میں نے ان کے کہنے پر موت کا انجیکشن لگا دیا اور سسک سسک کر مرنے سے بچا لیا۔

اس کے برعکس ہمارے مذہب میں خودکشی حرام ہے اور خودکشی ہی نہیں اسلام میں مایوسی کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے جو درحقیقت خودکشی کی جانب پہلا قدم ہے لہٰذا مسلمان خودکشی کرنے میں سب سے آخر میں آمادہ ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں تو خودکشی کی وجہ وہ نہیں ہے اوپر جس کا ذکر یورپ، امریکہ، جاپان اور کوریا کے حوالے سے کیا گیا، بلکہ ہمارے ملک میں لوگ بھوک، افلاس، غربت، بیماری، پولیس یا حالات کے تشدد کے باعث ایسا کرتے ہیں خصوصاً بے روزگاری تو اس میں سرفہرست ہے اکا دکا لوگ محبت یا امتحان میں ناکامی کی وجہ سے خودکشی کرتے ہیں۔ حکومت نے آج تک صرف ٹیکس وصول کرنے پر اپنی توانائی خرچ کی ہے مگر کبھی یہ نہیں سوچا کہ محض ٹیکس وصول کرنا ہی کافی نہیں بلکہ اس رقم کو احسن طریقے سے خرچ کرنا بھی اس کا اولین فرض ہے اسلام نے پیدا ہونے والے بچے کی بیت المال سے پرورش کا ذمہ لیا۔ اگر وہ غریب ہے ڈھائی فیصد زکوٰۃ امیروں سے وصول کرنے کا بھی اسی طرح طریقہ طے کیا آج ہم ڈھائی فیصد کے علاوہ نجانے کتنے بے حساب ٹیکس ادا کرتے ہیں مگر یہ خطیر رقم حکمرانوں کے شاہی اخراجات پر صرف ہوتی ہیں، غریبوں کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ ذرا اندازہ تو کیجئے کہ زکوٰۃ گزار اور ٹیکس گزار پر کتنا خرچ ہوتا ہے زکوٰۃ کے لئے اربوں روپے کی کٹوتی کرنے کے بعد مساکین، یتیموں اور غریبوں پر فی خاندان صرف تین سو روپے سے سات سو پچاس روپے ماہانہ خرچ ہوتے ہیں۔ کیا ہم نے آج تک کسی بھی بے روزگار نوجوان کو بیروزگاری الاؤنس دیا کیا یہ حکومت کی ذمہ داری نہیں ہے یورپ اور امریکہ میں تو پاکستانی اگر بے روزگار ہوں تو وہ ان کی کفالت کرتے ہیں۔ رہائش کے علاوہ بیروزگاری الاؤنس دیتے ہیں۔ مگر پاکستان میں پاکستانی نوجوانوں کو کیا دیا جاتا ہے اسلام نے زکوٰۃ کی رقم پر سب سے پہلا حق غریبوں اور محتاجوں کا تسلیم کیا۔ ہر گھر میں چولھا جلانا اسلامی فلاحی حکومت کا فرض ہے۔ اگر حکومت اپنا فرض پورا کرے تو نوجوانوں میں مایوسی حد درجہ کم ہو جائے، غربت دم توڑ دے اور خودکشی کے اسباب پیدا ہی نہ ہوں۔ جان تو ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے۔ مگر جب بات جسم و جاں کا رشتہ قائم رکھنے میں بھی ناکامی تک جا پہنچے تو اگلا راستہ موت ہی کا نظر آتا ہے۔ حالیہ دنوں میں خودکشی کے لئے خود سوزی کا بڑھتا ہوا رجحان جو سامنے آیا ہے، وہ نہایت تشویشناک ہے۔ اپنے آپ کو ہلاک کرنے کے تمام طریقوں میں سب سے زیادہ اذیت ناک جو طریقہ کار ہے، وہ خودسوزی کا ہے تو پھر لوگ جان دینے کے لئے یہی طریقہ کیوں استعمال کر رہے ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر ماہرین نفسیات کو توجہ دینی چاہئے۔ مگر

حالات اور واقعات بتاتے ہیں کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے خود اس میں ملوث ہیں۔ آج صورتحال یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ' باصلاحیت اور ملک وقوم کے لئے' اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے کچھ کر ڈالنے کے عزم سے سرشار نوجوان مارے مارے پھرتے ہیں اور ان کو کلرکی بھی نہیں ملتی۔ بار بار کی ناکامیاں ان کا دل توڑ دیتی ہیں' وہ مایوس ہوتے جاتے ہیں اور بالآخر یہ مایوسی کی کیفیت انہیں انتہائی فیصلے کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ پھر کوئی ڈاکو جنم لیتا ہے' کوئی تخریب کار پیدا ہوتا ہے' کسی اسمگلر کا اضافہ ہوتا ہے یا پھر اپنے ہی ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لینے جیسا سانحہ رونما ہوتا ہے۔ معاشرتی ناہمواری' عدم مساوات' زندگی کی دوڑ میں شامل ہونے کے مناسب مواقع کا نہ ہونا' اگر ان حالات کو پیش نظر رکھ کر حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو مسلمانوں میں خودکشی کا رجحان بہت کم نظر آئے گا اور اس کا سبب یہی ہے کہ مسلمانوں کا دین اسلام خودکشی کو حرام قرار دیتا ہے۔ تاہم حالیہ دنوں میں اپنے ہی ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاک کر دینے کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے جو تشویشناک بات ہے۔ حکومت کو چاہئے کہ اس خودکشی کے بڑھتے ہوئے رجحان پر قابو پانے کے لئے بیروزگاری الاؤنس کی ادائیگی کا فوری اہتمام کرے اور نوجوانوں کو پولیس کے تشدد اور غیر انسانی سلوک سے محفوظ رکھنے کے اقدامات اٹھائے۔ یہی وہ سب سے بڑی وجوہ ہیں جو ان نوجوانوں کو خودکشی اور خودسوزی پر مجبور کرتی ہیں۔ کپڑے اور مکان کے بغیر تو انسان زندہ رہ سکتا ہے۔ مگر روٹی کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں۔ اسی طرح انسان کو اپنی عزت نفس سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے' خصوصاً نوجوانوں کو۔ اور بات عزت کی آ جائے تو عزت داروں کے لئے عزت کے بدلے موت کا سودا بہت سستا سودا ہوتا ہے۔

شرم تم کو مگر نہیں آتی

پاکستانی کرکٹ ٹیم آج دنیا کی سب سے کمزور ٹیم بنگلہ دیش سے 62 رنز سے ہار گئی۔ اگرچہ کرکٹ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب تک آخری بال نہ پھینکی جائے' نتیجے کے بارے میں پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ مگر الحمدللہ ہماری ٹیم کو اپنے ہارنے کی اطلاع پہلے ہی مل جاتی ہے کیونکہ لوگ جیتنے کے لئے پیسے لیتے ہیں اور ہم ہارنے کے لئے۔ اس سلسلے میں چند مثالیں حاضر ہیں۔ جب زمبابوے کی ٹیم بالکل نووارد تھی تو ہم نے اس ٹیم کو حوصلہ دیا۔ ہم سب سے جیت رہے تھے۔ بڑی بڑی ٹیمیں ہمیں نہیں ہرا سکیں مگر ہماری ٹیم زمبابوے سے ہار گئی۔ اسی طرح شارجہ کپ میں جب ہم نے اپنے پہلے راؤنڈ میں انگلستان اور بھارت کو ہرا کر کوالیفائی کر لیا تو یکا یک ہم انہی دونوں ٹیموں سے ہار گئے۔ اور پھر اسی ٹیم نے شارجہ کپ جیت لیا۔ مذکورہ درمیان کے دو میچ ہارنے پر ہمارے کھلاڑی شرمندہ نہیں تھے۔ بالکل اسی طرح ہم نے دیکھا کہ ورلڈ کپ میں بنگلہ دیش سے شکست کے بعد بھی ہمارے سینئر کھلاڑی ہشاش بشاش تھے۔ کسی شرمندگی کا کوئی احساس تک نہیں تھا۔ ستم بالائے ستم ہمارے کپتان صاحب فرما رہے تھے کہ شکر ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائی سے ہارے۔ اتنی دور کی کوڑی پوری قوم میں کسی ایک کو نہیں سوجھ سکتی تھی جو اللہ نے ہمارے سینئر کھلاڑیوں اور بالخصوص ہمارے کپتان کے دل میں ڈال دی۔ کہ چلو بھائی اپنے مسلمان بھائی سے ہارنا بھی نیک شگون ہو سکتا ہے۔ میچ شروع ہوتے ہی پہلا جھٹکا قوم کو اس وقت لگا جب وسیم اکرم نے ٹاس جیت کر بنگلہ دیش کو پہلے بیٹنگ کا موقع دیا۔ حالانکہ بنگلہ دیش کی ٹیم جمعہ جمعہ آٹھ دن کی بھی پیداوار نہیں ہے۔ ہم نے ٹاس جیت کر ریکارڈ بیٹنگ کرنے کے بجائے خود بنگلہ دیش کا سب سے زیادہ اسکور کرنے کا اپنا ریکارڈ بھی اپنے خلاف بنوا دیا۔ کھیل کے دوران ایسا لگتا تھا کہ ہم بنگلہ دیش کے ساتھ نہیں کھیل رہے بلکہ اپنی کسی سسرالی ٹیم کو میچ کھلا رہے ہیں۔ اگرچہ اس میچ کی ہار جیت سے ہماری ٹیم کی کوالیفکیشن پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مگر افسوس صد افسوس اگر ہارنا ہی تھا تو آسٹریلیا' نیوزی لینڈ

سے بھی ہارا جا سکتا تھا۔ اگر جوا کھیلنا بھی تھا تو کم از کم اپنی شایان شان ٹیم سے ہارنے پر جوا کھیلتے۔ قوم کو جو تم نے پہلے میچوں کو جیت کر خوشی دی تھی وہ تمام کی تمام ایک دن میں ندامت کے ساتھ واپس لے لی۔ اس میں تمام سینئر کھلاڑی سو فیصد ملوث رہے ہیں۔ اور اس کے سربراہ ہماری ٹیم کے کپتان وسیم اکرم ہیں جنہیں جوئے کے اس کھیل میں اب مہارت بھی حاصل ہو چکی ہے جبکہ جوا ایک اور پچاس کے بھاؤ لگا ہوا ہو۔ مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ ہماری فیکٹری میں ایک سپلائر شہد سپلائی کرتا تھا۔ ہمارے کوالٹی کنٹرول والوں نے اس کو گلوکوز شہد میں ملانے پر پکڑ لیا۔ پہلے تو وہ انکار کرتا رہا کہ میرا شہد اصلی ہے۔ اس میں گلوکوز نہیں ملا ہوا۔ مگر جب کوالٹی کنٹرول انسپکٹر نے مختلف طریقوں سے ثابت کیا کہ شہد میں گلوکوز بھی ملا ہوا ہے۔ مگر سائنسی طریقہ سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ کتنا گلوکوز ہے اور کتنا شہد' تو وہ پھٹ پڑا اور کہنے لگا کہ خدا غارت کرے۔ شہد بنانے والوں کو جب شہد سو روپے کلو ہو اور گلوکوز چھ روپے کلو تو کس کا دل نہیں چاہے گا کہ وہ شہد اصلی بیچے۔ وہ تو اس لالچ میں شہد میں گلوکوز ملا کر ہی رہے گا تو اگر آپ کی جیت کا بھاؤ صرف ایک روپیہ ملے اور ہارنے پر 50 روپے ملیں تو کون پاگل ہوگا جو جیت کے لئے کھیلے گا۔ قوم جائے بھاڑ میں۔ آپ تو اس بہتی گنگا میں نہا لیں۔ پھر کرکٹ تو ہے ہی چانس کا نام۔ پھر ہماری ٹیم کے منیجر بھی فرماتے ہیں کہ یہ میچ فکس نہیں تھا۔ یہ صرف الزام ہی الزام ہے تو جناب اگر آپ میں غیرت ہوتی تو ظفر الطاف صاحب آپ اتنی کمزور ٹیم سے 62 رنز کے بڑے مارجن سے ہارنے پر کم از کم اپنا استعفیٰ دے دیتے اور ٹیم کے ہارنے کی ذمہ داری بھی قبول کرتے۔ مگر شاید مسلمانوں میں ایسا کوئی دستور نہیں ہے کہ کسی بھی خرابی کے لئے یا اپنی ذمہ داری نہ نبھانے پر کم از کم استعفیٰ ہی دے کر قوم کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے بجائے اس پر مرہم رکھ دیتے اور قوم مان جاتی واقعی آپ نے غلط کو چنگ کی تھی۔ اسی وجہ سے وہ بنگلہ دیش سے ہار گئی۔ ابھی میچ شروع نہیں ہوا تھا' میرے دفتر میں دو بڑے صحافی حضرات بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آج بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان میچ کیسا رہے گا۔ میں نے جواب دیا کہ اگر ہماری ٹیم کے دماغ میں کوئی فتور نہ آئے تو ہم کو اپنا ریکارڈ بہتر بنانے کا سنہری موقع مل رہا ہے۔ میرے لفظ فتور سے مراد یہی میچ فکسنگ تھا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا ہمارے سینئر کھلاڑیوں کے دل میں فتور آ گیا اور جب اس فتور کو وسیم اکرم جیسے کی قیادت مل جائے تو اس میں مزید چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اور وہ سبحان اللہ کیا تاریخی جملہ دہراتے ہیں کہ چلو ہم کسی مسلمان بھائی سے ہی ہارے ہیں اور بقول غالب۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

اگر ہم اس ورلڈ کپ کا تجزیہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ہمارے چاروں ابتدائی کھلاڑی یعنی سعید انور' شاہد آفریدی' اعجاز اور عبدالرزاق مسلسل ناکام رہے ہیں اور اگر ابتدائی کھلاڑی پرفارمنس نہ دے سکیں اور آنے والے کھلاڑی رک کر احتیاط اور ذمہ داری سے نہ کھیلیں تو جلدی میں باقی کھلاڑی بھی یکے بعد دیگرے آؤٹ ہو جاتے ہیں۔ مگر بنگلہ دیش کے میچ کے علاوہ دیکھا جائے تو ہمیں فرق صاف نظر آئے گا کہ دوسرے میچوں کی طرح جب ہمارے پہلے چار کھلاڑی اکثر آؤٹ ہو ہی جاتے تھے مگر بعد کے کھلاڑیوں نے خاص طور پر انضمام الحق' یوسف یوحنا' معین خان اور خود وسیم اکرم نے وکٹ پر ٹھہر کر زیادہ سے زیادہ رنز بنائے۔ مگر اس میچ میں تو ایسا لگ رہا تھا کہ ہم کسی بہت بڑی ٹیم کے سامنے کھیل رہے ہیں۔ ہماری بولنگ کلک نہیں ہو رہی تھی۔ جس کی وجہ سے بنگلہ دیش نے 224 رنز کا ٹارگٹ دیا۔ اس کے ٹیل اینڈ رز بھی چوکے لگا کر چلے گئے۔ جبکہ اسکاٹ لینڈ اور بنگلہ دیش کے میچ میں کمنٹیٹران بنگلہ دیشی بلے بازوں کو کہہ رہا تھا کہ ایک گھنٹہ ہو گیا ہے اور کسی بھی کھلاڑی نے چوکا نہیں لگایا۔ ان کا جب آخری کھلاڑی پچاسویں اوور میں کھیلنے آیا تو اس نے دوسری ہی گیند پر چوکا لگا دیا یہ تو تھا ہماری بولنگ کا معیار۔ اس سے بھی گرا ہوا کھیل ہم نے بیٹنگ میں پیش کیا کہ کوئی بھی کھلاڑی لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ بنگلہ دیش جیسی ٹیم سے کھیل رہا ہے۔ اگر وسیم اکرم کو اپنے ہی بھائی سے ہارنا تھا تو کم از کم اس بھائی کو وہ بتلا دیتے کہ جاؤ تم اپنے جیتنے پر رقم لگا لو تو بنگلہ دیش والے خود اپنے اوپر ایک اور پچاس کے بھاؤ پر رقم لگا کر ان کو مالی فائدہ بھی پہنچا سکتے تھے۔ اس وقت آپ کے دل میں یہ بھائی سے ہارنے والی قربانی کے ساتھ ساتھ مالی فائدہ پہنچانے کی ہمدردی نہیں آئی اور آپ کیسے بھائی تھے کہ اکیلے اکیلے رقم ہضم کر گئے اور قوم کو پہلے کی طرح کرب میں مبتلا کر گئے۔ میں نے پہلے بھی لکھا تھا اور اب بھی کھل کر لکھ رہا ہوں کہ جب تک وسیم اکرم جیسے کھلاڑی ہماری ٹیم میں رہیں گے یہ میچ فکسنگ کا جوا چلتا رہے گا اور ہم صرف کمزور ٹیموں ہی سے ہاریں گے۔ اور وہ بھی شرمناک طریقے سے۔ آپ یاد کریں جب شارجہ میں ہماری ٹیم جیتنے کے بعد دونوں میچ ہاری۔ اس وقت سے جاوید میانداد کے خلاف سینئر کھلاڑیوں نے بغاوت کر دی تھی اور شارجہ کپ جیتنے کے باوجود میانداد کو فارغ کر دیا تھا۔ کیونکہ میانداد کی موجودگی میں وہ کھل کر جوا نہیں کھیل سکتے تھے۔ اس لئے یہی سینئر کھلاڑی اس کانٹے کو ہٹا کر آزاد ہو گئے۔ اور جب ان کو ظفر الطاف جیسے کوچ مل گئے تو کون ان کا راستہ روک سکتا تھا۔ اب بھی وقت ہے۔ ورلڈ کپ کا رزلٹ تو نہیں معلوم کیا ہوگا کیونکہ جب شیر کے منہ کو ایک مرتبہ انسان کا خون لگ جائے تو وہ باز نہیں آتا۔ اسی طرح ہماری ٹیم کو جب جوئے کی عادت پڑ ہی گئی ہے تو وہ کسی وقت بھی اس ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔ کیونکہ ہارنے میں کسی کو باہر سے نہیں بلانا پڑتا۔ وہ طے شدہ طریقہ سے ہار جاتے ہیں۔ لہٰذا

ورلڈ کپ کے بعد تمام سینئر کھلاڑیوں کو ٹیم سے باہر کریں اور الحمدللہ ہمارے پاس اس وقت باصلاحیت جونیئر کھلاڑیوں کی کمی نہیں ہے۔ ایک جائے تو دو باہر بیٹھے ہیں۔ اس نئی ٹیم کو جاوید میانداد کے حوالے کر دیں کیونکہ گندہ خون جب اچھے خون میں مل جاتا ہے تو اچھے اور برے کی تمیز ختم ہو جاتی ہے اور یہ تجزیہ قوم بار بار دیکھ چکی ہے۔ ورلڈ کپ میں چار سال کا وقفہ ہوتا ہے۔ اس چار سال کے وقفے میں ہم شعیب اختر، رزاق، یوسف یوحنا اور اظہر محمود کے ساتھ ملا کر نئے کھلاڑی میدان میں لائیں اور ان سینئر کھلاڑیوں کو عبرت ناک طریقہ سے خواہ ورلڈ کپ جیت ہی کیوں نہ جائیں اس جوئے کی ایسی سزا دیں کہ وہ یادگار رہے اور کسی کو بھی قوم کے ساتھ مذاق کرنے کی جرات نہ ہو۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ان جواریوں کی اور حوصلہ افزائی ہوگی۔ اس طرح نئے کھلاڑی بھی اس گھناؤنے کھیل میں شامل ہو جائیں گے اور پاکستان کا نام ایک طرف روشن ہوگا تو دوسری طرف بنگلہ دیش جیسی ٹیم سے ہارنے پر پوری قوم کا سر ندامت سے جھک جائے گا اور وہ پاکستانی کھلاڑیوں کو بکاؤ مال سمجھیں گے۔ لہٰذا اب فیصلہ کر لینا چاہئے اور اس ٹیم کا اگر وہ ورلڈ کپ جیت بھی جائے تو ایئرپورٹ پر کوئی استقبال نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ اب قوم کو ان کھلاڑیوں کو آئینہ دکھانا چاہئے کیونکہ زندہ قومیں ایک طرف اپنے ہیروز کو نہیں بھلاتیں تو دوسری طرف قوم اور عوامی احساسات سے کھیلنے پر ان غداروں کو بھی معاف نہیں کرتیں۔

کوٹہ سسٹم نہیں کھوٹا سسٹم کہیے

آخر کار سندھ کی شہری آبادی پر ایک مرتبہ پھر کوٹہ سسٹم مزید بیس سال کے لئے مسلط کر دیا گیا۔ اس سسٹم کے بانی مرحوم ذوالفقار علی بھٹو تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ چونکہ سندھ کی اکثریت دیہی علاقوں سے تعلق رکھتی ہے اور تعلیمی معیار میں شہری آبادی سے مقابلہ نہیں کر سکتی اس لئے دس سال کے لئے یہ کوٹہ سسٹم نافذ کیا تا کہ سرکاری نوکریوں میں شہری آبادی کے ساتھ ساتھ دیہی علاقوں کے نوجوانوں کو ان کا حصہ دے کر ان میں موجود احساس محرومی ختم کیا جائے۔ بعد ازاں جنرل ضیاء الحق نے کوٹہ سسٹم کی میعاد میں دس سال کی توسیع کر دی۔ آیئے ہم اس کا تجزیہ کرتے ہیں کہ اس سے شہری نوجوانوں کی کیسے حق تلفیاں ہوئیں۔ سندھ میں پہلی مرتبہ جب کوٹہ سسٹم نافذ ہوا تو انہوں نے اس کو خیر سگالی کے جذبے کے تحت قبول کر لیا۔ مگر دس سال تک اس کوٹہ سسٹم پر یک طرفہ عمل ہوتا رہا۔ اس وقت سندھ کی آبادی 60 فیصد سندھی بولنے والوں پر مشتمل تھی جو دیہات میں رہتی تھی۔ جہاں نہ بجلی تھی نہ گیس اور نہ ہی سڑکیں جس کی وجہ سے یہ علاقے پسماندگی کا شکار تھے۔ اسی طرح ان کو شہری آبادی کی طرح تعلیمی سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ لہٰذا دیہی علاقوں کے نوجوان چونکہ تعلیمی معیار پر سرکاری نوکریاں نہیں حاصل کر سکتے تھے۔ اس لئے کوٹہ سسٹم نافذ کر کے ان کو اضافی نوکریاں دلانے کا بندوبست کیا گیا۔ جس سے شہری آبادی کے نوجوانوں کو جن میں اکثریت اردو بولنے والوں کی تھی اس کوٹہ سسٹم کی وجہ سے سرکاری نوکریوں سے دور کر دیا گیا۔ اول تو سندھی بولنے والوں کی اکثریت کی وجہ سے سرکاری نوکریاں بھی سندھی افسران ہی دیتے تھے۔ جس سے شہروں میں بھی اردو بولنے والوں کو کم ہی چانس ملتا تھا۔ حالانکہ تعلیمی معیار کا اگر جائزہ لیا جائے تو اردو بولنے والے اس پر پورے اترتے تھے۔ مگر اس اقربا پروری کی وجہ سے 95 فیصد نوکریاں صرف سندھی بولنے والوں کو مل جاتی تھیں اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس کی زندہ مثال دیکھنا ہو تو سندھ سیکریٹریٹ جا کر دیکھ لیجئے۔ جہاں چند اردو بولنے والے افسران باقی رہ گئے

ہیں۔ جو ریٹائرمنٹ کے قریب ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جب کوٹہ سسٹم کے تحت دیہی علاقے کے نوجوان بھرتی کئے جاتے ہیں تو ان کی اولین کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ شہروں میں پوسٹنگ کرانے میں اپنا وہی اثر ورسوخ استعمال کریں جو انہوں نے نوکریاں حاصل کرنے میں استعمال کیا تھا۔ جبکہ اردو بولنے والے شہری نوجوان کو اکثر اندرون سندھ ٹرانسفر کر دیا جاتا ہے۔ اس سے اس کا دہرا استحصال ہوتا ہے۔ ایک تو اس کا شہری حق مارا جاتا ہے اور اس دیہاتی نوجوان کو شہریوں پر مسلط کر دیا جاتا ہے جس کا نہ تو وہ حقدار ہوتا ہے اور نہ ہی اس کا شہری تجربہ ہوتا ہے۔ دیہی علاقے کے کوٹے پر نوکری پانے والا شہری علاقہ میں نوکری کا حقدار نہیں بنتا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے شہری علاقے کے نوجوان سرکاری نوکریاں حاصل کرنے میں اکثر ناکام رہتے تھے اور میرٹ کے بجائے اثر ورسوخ اور رشوت کے ذریعہ نوکریاں دی جاتی رہیں۔ اب جبکہ اس صوبے میں اصل آبادی غیر سندھی بولنے والوں کی 55 فیصد سے بھی تجاوز کر چکی ہے۔ اس کوٹہ سسٹم کو جواب کھوٹا سسٹم ثابت ہو چکا ہے۔ یکا یک قومی اسمبلی اور پھر سینٹ میں بھی اس کا بل پاس ہو چکا ہے۔ ایک مرتبہ پھر اس کو صرف صوبہ سندھ میں دس نہیں بیس سال کے لئے مسلط کر دیا گیا ہے اور مسلم لیگ کو باوجود اس کے کہ وہ سینٹ میں اقلیت کی وجہ سے کوئی بھی قانون پاس نہیں کرا سکی۔ زبردست اکثریت سے ہی نہیں اس کی مخالفت میں صرف اور صرف ایک ووٹ کسی مرد مجاہد نے ڈال ہی دیا حالانکہ اس کوٹہ سسٹم پر کئی روز تک بہت سے سینیٹروں نے تقاریر کی تھیں اور واویلا مچایا تھا کہ یہ شہری نوجوانوں کے ساتھ یکطرفہ زیادتی ہے اور کوٹہ سسٹم کی لعنت کو ختم کرنے پر پورا زور لگایا تھا جبکہ ہماری عدلیہ بھی اس کو غیر قانونی قرار دے چکی ہے تو پھر یہ سسٹم صوبہ سندھ کے شہریوں کے ساتھ ہی کیوں ہوتا تھا اور اب بھی ہو رہا ہے میں کہتا ہوں اگر واقعی یہ کوٹہ سسٹم اچھا ہے تو سب سے پہلے اس کو پاکستان کے سب سے بڑے صوبے پنجاب میں کیوں نہیں نافذ کیا جاتا جس کی 80 فیصد آبادی دیہاتوں اور قصبوں پر مشتمل ہے جہاں پنجابی، سرائیکی، پوٹوہار، سندھی، اردو، ملتانی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اگر یہ واقعی ضروری ہے تو اس کا تجربہ صوبہ بلوچستان میں کیوں نہیں کیا جاتا جہاں بلوچی، سندھی، بروہی، مکرانی، پشتو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جہاں صرف ایک بڑا شہر کوئٹہ ہے۔ باقی تمام آبادی چھوٹے چھوٹے گاؤں پر مشتمل ہے جہاں آج بھی سڑکیں نہیں ہیں۔ تعلیمی ادارے نہ ہونے کے برابر ہیں جہاں آج بھی بجلی گیس جیسی بنیادی ضرورتیں موجود نہیں ہیں جہاں آج بھی پاکستان ٹیلی ویژن تک کی نشریات نہیں دیکھی جاسکتیں۔ کیا اس کوٹہ سسٹم سے ان دیہی علاقوں کے نوجوانوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاسکتی تھی۔ اگر یہ سسٹم واقعی اچھا ہے تو اس کو صوبہ سرحد میں کیوں نہیں نافذ کیا جاتا۔ جہاں پشتو، ہندکو، پنجابی، چھاچھی اور طرح طرح کی علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جہاں

دیہاتی ہی نہیں۔ پہاڑی علاقوں پر مشتمل اکثریت پسماندگی کا شکار ہے۔ جہاں آج بھی لوگ بغیر بجلی اور گیس کے پہاڑوں اور غاروں میں رہتے ہیں۔ جہاں سڑکیں تک ناپید ہیں اور بعض بعض علاقوں تک پہنچنے کے لئے دو دو دن پیدل چلنا پڑتا ہے۔ حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو سینٹ کے تمام اراکین علاوہ ایک ووٹ کے چاروں صوبوں کے منتخب افراد نے ووٹ دے کر یہ ثابت کیا کہ وہ اس کوٹہ سسٹم کے حامی ہیں۔ لہٰذا دیہی علاقوں کے لئے ضروری اس سسٹم کو پورے ملک میں نافذ کیا جائے۔ صرف صوبہ سندھ میں ہی کوٹہ سسٹم کیوں ضروری ہے۔ جبکہ یہ صوبہ سب سے زیادہ خوشحال ہے۔ اس کی شہری آبادی بھی دیگر صوبوں کی نسبت سب سے زیادہ ہے۔ جہاں ہر گاؤں میں بنیادی سہولتیں موجود ہیں۔ سڑکیں، اسپتال، اسکول، کالج، یونیورسٹیاں بھی موجود ہیں۔ جہاں شہری اور دیہی نوجوانوں میں اب واضح فرق باقی نہیں رہ گیا کیونکہ ہر گاؤں کے ساتھ اب شہر آباد ہو چکے ہیں۔ غربت اور پسماندگی دوسرے صوبوں کی نسبت کم ہے پھر کوٹہ سسٹم کی لعنت کو سندھ کے شہری نوجوانوں پر ہی کیوں مسلط کر دیا گیا ہے اس کوٹہ سسٹم کو جواب عملاً کھوٹا سسٹم ہے۔ کیوں نہ اٹھا کر بحر عرب میں غرق کر دیں۔ کہاں گئے وہ اہل قلم جو مظلوموں کے حق میں کالم لکھتے ہیں۔ ظلم کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کیا یہ سندھ کے شہریوں کے خلاف ظلم نہیں ہے؟ اسلام کھل کر کہتا ہے کہ مسلمان وہ ہے جو اپنے لئے جس چیز کو پسند کرے وہی اپنے مسلمان بھائی کے لئے بھی پسند کرے اور جو خود اس کو پسند نہیں وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے بھی ناپسند ہونی چاہئے۔ یہ کیسا دہرا معیار ہے جو صرف اسی صوبے کے ساتھ مسلسل بیس سال سے ہو رہا ہے اور مزید بیس سال ہوتا رہے گا۔ وزیر اعظم نواز شریف صاحب آپ تو بار بار ٹیلی ویژن پر آ کر اعلان کرتے ہیں کہ نواز شریف صرف ظالموں کے خلاف اور مظلوموں کا بھائی ہے تو پھر اس ظلم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیجئے یا پھر ملک کے دیگر صوبوں میں بھی کوٹہ سسٹم نافذ کر دیجئے تاکہ پورا پاکستان اس سے ''فائدہ'' اٹھا سکے۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ آپ ایسا ظلم دیگر صوبوں کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اگر آپ نے ایسا کیا تو پورا ملک سراپا احتجاج بن جائے گا۔ اور سندھ کے شہری عوام جواب احتجاج کر کے تھک چکے ہیں۔ نڈھال پڑے اپنے مستقبل کو تاریک ہوتا دیکھ کر بھی کچھ نہیں کہتے۔ اب وہ اندر ہی اندر سلگ رہے ہیں خدارا اس چنگاری کو ہوا نہ دیں اس یکطرفہ ظلم کو ختم کر دینا ہی بہتر ہے۔

کشمیر کا حل

پچھلے چند ہفتوں سے پاکستان ایک مرتبہ پھر حالت جنگ میں ہے۔ یہ جنگ ہمارے ازلی دشمن بھارت نے ہم پر مسلط کردی ہے اور کشمیر کے مسئلہ کی آڑ میں موجودہ بھارتی وزیراعظم اس کے ذریعے الیکشن جیتنا چاہتے ہیں اور صرف ایک ووٹ کی کمی سے ان کی جو حکومت برخاست ہوئی تھی اس کا وہ کانگریس سے بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ کانگریس جو بی جے پی کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے سونیا گاندھی کی سربراہی میں دوبارہ اٹھی ہے۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے کشمیر کا ہوا بنا کر ہندوستان اور پاکستان دونوں کو حالت جنگ تک پہنچا دیا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ دونوں ممالک ایٹمی صلاحیت رکھتے ہیں اور دونوں اس کے نقصانات سے آگاہ ہیں۔ ایک سال قبل جب ہندوستان نے ایٹمی دھماکے کئے تو پاکستان نے خاموشی سے اس کا جائزہ لیا اور ہندوستانی حکمرانوں نے ان دھماکوں کے بعد پاکستان کو دھمکیاں دینا شروع کیں اور پاکستان کو مجبور کردیا کہ وہ بھی اپنی طاقت کا مظاہرہ کرے چنانچہ پاکستان نے جب یکے بعد دیگرے ایٹمی دھماکے کئے تو ہندوستانی حکمرانوں نے واویلا مچایا کہ پاکستان نے کیوں دھماکے کئے اور اپنے دھماکوں کو تعمیری قرار دے کر پاکستانی صلاحیت کو جارحیت سے تشبیہہ دی۔ گویا پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کو تخریبی اور اپنی صلاحیت کو تعمیری قرار دیا۔ پھر بھی موجودہ حکومت نے خیرسگالی کے طور پر موجودہ عارضی وزیراعظم واجپائی کا لاہور واہگہ پر استقبال کرکے اسلامی تعلیمات کے مطابق ہمسایوں سے اچھے سلوک کا مظاہرہ کیا۔ مگر ہندوؤں نے اپنی ذہنیت روایتی انداز میں پیش کرکے ہمارے وزیرخارجہ سرتاج عزیز کے موجودہ دورے کے موقع پر تنگ نظری کی مثال برقرار رکھی جس کی وجہ سے یہ دورہ ناکام رہا۔

بھارت اور پاکستان دونوں پسماندہ ملک ہیں۔ دونوں ملکوں میں غربت، جہالت، بھوک عام ہے۔ دونوں قرض لینے والے ملکوں میں بھی شمار ہوتے ہیں۔ گزشتہ پچاس سال سے کشمیر کی وجہ سے کھربوں ڈالر کا اسلحہ

ضائع کرچکے ہیں۔ غریب ہوتے ہوئے اس دشمنی کی وجہ سے 60 فیصد بجٹ فوج پر خرچ کرچکے ہیں۔ اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ عوام مہنگائی اور ٹیکسوں کے بوجھ تلے بری طرح دبے ہوئے ہیں۔ صرف کشمیر کی وجہ سے دو باضابطہ جنگیں ہوچکی ہیں۔ ہزاروں گھر اس میں اجڑ چکے ہیں۔ خود کشمیر میں ہزاروں مسلمان اور ہندوستانی فوجی ہلاک ہوچکے ہیں۔ ہندوستان کی حکومت کشمیر میں مستقل ایک بڑی فوج رکھتی ہے اور کشمیر ہمیشہ حالت جنگ میں رہتا ہے۔ اتنے بڑے بڑے نقصانات کے باوجود ہندوستان جارحیت سے باز نہیں آتا۔ خود ہندوستانی تاجر کشمیر کے مسئلہ سے پریشان ہیں۔ اس کی وجہ سے پورے ہندوستان کی معیشت سخت متاثر رہتی ہے اور پاکستان کی منڈی ان کے ہاتھ سے نکل رہی ہے۔ صنعت کار چاہتے ہیں کہ کشمیر کا ہر صورت میں فیصلہ ہوجانا چاہئے۔ مگر حکمران اس مسئلے کو اپنی سیاست چمکانے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اسی وجہ سے آج تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوسکا اور نہ ہی اس کے حل ہونے کے آثار ہیں۔ کشمیر کی بیشتر آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے جو پاکستان سے الحاق چاہتے ہیں۔ اگر ہندوستان کشمیر کو آزاد کرتا ہے تو اس کو خالصتان اور دیگر لسانی تحریکوں کا سامنا کرنا پڑے گا جس سے بھارت روس کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گا کیونکہ روس کی طرح ہندوستان میں بھی مختلف قومیں رہتی ہیں اور پچاسوں زبانیں بولی جاتی ہیں مختلف مذاہب ہیں خود ہندوؤں میں مختلف فرقے ہیں اگرچہ اکثریت نیچی ذات کے اچھوت ہندوؤں کی ہے مگر حکومت برہمنوں 'پنڈتوں' کھتری اور اونچی ذات والے کررہے ہیں جو ان اچھوتوں کا برسوں سے استحصال کررہے ہیں جس کی وجہ سے ان اچھوتوں میں خود ہندوؤں سے نفرت پائی جاتی ہے۔ جبکہ ہندوستانی مسلمان اس چھوت چھات سے پاک ہے۔ اسی وجہ سے اکثر فسادات میں مسلمانوں اور اچھوتوں نے مل کر ہندو بنیوں کی پٹائی کی جس کی وجہ سے بعد میں فوج مداخلت کرکے ان ہندوؤں کی حفاظت کرتی ہے اب جبکہ ہندوستان نے روایتی جارحیت پاکستان پر مسلط کردی ہے اور وزیراعظم نواز شریف صاحب کے خیرسگالی جذبات کے جواب میں پاکستان کی سرحدوں پر اپنی فوج تعینات کردی ہے اور بغیر اعلان جنگ پاکستان کی سرحدوں پر اندھا دھند گولہ باری کرکے کئی پاکستانیوں کو شہید کردیا ہے۔ اقوام متحدہ اور امریکہ ایک مرتبہ پھر خاموش ہیں ان حالات میں پاکستان کو چاہئے کہ چین سمیت تمام مسلمان ممالک سے اس جارحیت کی مذمت کرائے اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے سیاچن اور کارگل کی طرح ہندوستان کا منہ توڑ جواب دے۔ قوم اس اقدام پر وزیراعظم نواز شریف کے ساتھ ہے کیونکہ شہادت مسلمانوں کی اصل زندگی ہے اور مسلمان غلام رہنے پر موت کو ترجیح دے گا۔ جنگ کے بظاہر خطرات تو نظر آرہے ہیں مگر ابھی تک یورپ اور امریکہ کے باشندوں کو ہندوستان اور

پاکستان جانے سے روکنے کے لئے واضح ہدایات نہیں ملی ہیں۔ ورنہ اگر جنگ کا خطرہ ہوتا تو یقیناً امریکہ اور یورپی ممالک اپنے شہریوں کو پہلے سے آگاہ کر دیتے۔ اگر ہندوستان نے واہگہ کی سرحد سے حملہ کیا تو خالصتان کے حامی انہیں اپنے علاقے سے نہیں گزرنے دیں گے کیونکہ گولڈن ٹیمپل کے آپریشن کے بعد سے اگرچہ خالصتان کی تحریک کمزور ضرور پڑ گئی ہے مگر ختم نہیں ہوئی، کسی بھی وقت دوبارہ اٹھ سکتی ہے۔ موجودہ حکومت کو چاہئے کہ اس تحریک کے سرکردہ افراد کو ہر طرح کی امداد دے کر خود ہندوستان کے لئے ایک دفعہ پھر محاذ کھڑا کر دے جس طرح سابق صدر ضیاء الحق نے اپنی سیاسی بصیرت سے اس تحریک کو زندہ کر دیا تھا اور پنجاب کے سکھوں نے آزاد خالصتان کا نعرہ لگا کر پنجاب میں کشمیر کی طرح گورنر راج نافذ کروا دیا تھا۔ جس کی وجہ سے گولڈن ٹیمپل آپریشن ناگزیر ہو گیا تھا۔ اور جس طرح ٹیمپل کی بے حرمتی کی گئی تھی اور اندرا گاندھی کی ہلاکت کے بعد سکھوں کے قتل عام والے زخموں کو ہرا کر دیا گیا تھا تاکہ دشمن کو اندرونی اور بیرونی دونوں محاذوں پر الجھا کر کشمیر کے مسئلے کو حل کروائیں۔ اس وقت کانگریس بھی کشمیر کے جھگڑے کو بی جے پی سے سیاسی چال بتا رہی ہے تاکہ کسی طرح بھی الیکشن ملتوی نہ ہوں اور بی جے پی اس کی آڑ میں اپنی سیاست نہ چمکا سکے۔ خود کشمیری مجاہدین بھی طالبان کی طرح اب بھارت کے خلاف ڈٹ گئے ہیں۔ لہٰذا اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کشمیر کا مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حل کریں تمام قوم اور قومی رہنماؤں کو اعتماد میں لیں۔ قوم آپ کے اور فوج کے شانہ بشانہ قومی امنگوں سے سرشار ہے خود ہندوستان کو بھی ہماری قومی حمیت اور ایٹمی صلاحیت کا پورا پورا احساس ہے۔ واجپائی کی حماقتوں کا جواب دینے کا اس سے اچھا موقعہ نہیں ملے گا۔ کیونکہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ بھارتیوں کو بتا دو کہ انہوں نے کس قوم کو للکارا ہے۔

کرکٹ کا ڈراپ سین

آخر کار پاکستانی ٹیم ورلڈ کپ کے فائنل میں آخری انجام تک پہنچی۔ اور عبرت ناک شکست سے دوچار ہوئی۔ کپتان وسیم اکرم جب ہارنے پر اپنا انعام لینے پہنچے تو ان کے چہرے پر کسی ندامت یا ہار پر افسوس کا کوئی تاثر تک نہیں تھا بلکہ انہوں نے مسکرا کر رقم کا چیک وصول کیا اور کہا کہ کھیل میں ہار جیت تو ہوتی ہے جبکہ جنوبی افریقہ کا کپتان سیمی فائنل ہارنے پر بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ کھیل میں تو ہار جیت ہوتی ہے مگر جب کھیل ہو نہ کہ جوا کھیلا جائے۔ آسٹریلیا اور ساؤتھ افریقہ کا میچ آخری بال تک کھیلا گیا۔ مگر ہمارا فائنل صرف 21 اوورز میں ختم ہو گیا اور قوم کو ان جواریوں نے دو گھنٹے پہلے ہی فارغ کر دیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ وسیم اکرم کی والدہ قوم کے احتجاج پر افسوس کا اظہار کر رہی ہیں اور فرماتی ہیں کہ میں وزیر اعظم نواز شریف سے بات کروں گی۔ کیا والدہ وسیم اکرم بھول گئیں کہ ایک سال قبل جب پاکستان شارجہ میں ہارتے ہارتے راشد لطیف کی بدولت جیت گیا تھا تو لاہور کے ایک بکی نے ان کے شوہر محمد اکرم اور بیٹے نعیم اکرم کو اغوا کر کے تین دن تک یرغمال رکھا تھا اور وسیم اکرم نے اس سے لی ہوئی رقم واپس کی تب دونوں باپ بیٹے رہا ہوئے تھے۔

قارئین اگر آپ نے میرا کالم پڑھا ہو گا تو میں نے فائنل میں اس جوئے کی پیشن گوئی کر دی تھی کیونکہ شیر کو انسان کا خون اور جواری کو جوئے کی لت ایک بار لگ جائے تو وہ کبھی نہیں چھوٹتی اور وسیم اکرم کو کرکٹ کے کھلاڑی کے ساتھ ساتھ جوئے کے بھی زبردست کھلاڑی ہیں پھر جب ان کو سلیم ملک جیسے شاطر تجربہ کار پرانے جواری کا ساتھ مل جائے تو وہ اس سنہری موقع سے کیوں نہ فائدہ اٹھاتے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ آج تک کسی کھلاڑی کو کوئی سزا نہیں ملی۔ البتہ راشد لطیف اور باسط علی کو سچ کہنے پر ٹیم سے باہر کر دیا گیا۔ اب کون بیوقوف گواہی دے گا اور بہت سے سینئر کھلاڑی تو اپنا آخری میچ کھیل رہے ہیں۔ نئے کھلاڑی اپنی جگہ

بنانے کے لئے وسیم اکرم کی خوشنودی حاصل کر کے مزید ٹیم میں رہنا چاہتے ہیں۔ اگر اس فائنل کا تجزیہ کیا جائے تو اطلاعات کے مطابق اصل جوا پاکستان کے کپتان وسیم اکرم کے ٹاس جیتنے کے بعد ہی شروع ہوا۔ کیونکہ ٹاس جیتنے کے بعد پاکستان کو پہلے کھیلنے کا موقع ملا اور اسی وجہ سے تمام روپیہ پاکستان پر لگا کیونکہ پاکستان پہلے ہی آسٹریلیا کو ہرا چکا تھا۔ تقریباً 3600 کروڑ روپے اس ورلڈ کپ کے فائنل میں پاکستان پر لگے تھے۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی رقم ایک رات میں ہارنے پر واویلا تو ہونا ہی تھا تو ہمارے کپتان نے یہ سوچا کہ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ان کو فارغ کر دیا جائے گا چنانچہ ان کے بھائی نعیم اکرم اور انضمام الحق کے بھائی انتظار الحق نے دوہرا فائدہ اٹھایا۔ ایک طرف پاکستان کے ہارنے پر پیسہ لگایا اور دوسری طرف آسٹریلیا کو جتانے پر میچ فکسنگ کروا کر 150 کروڑ روپے سینئر کھلاڑیوں کو دلوا دیئے۔ ملک اور قوم جائیں بھاڑ میں۔ اس سے پہلے بھی یہ دونوں کھلاڑی بنگلہ دیش کے میچ میں دو دو لاکھ پاؤنڈ کی رقم بنگلہ دیش پر لگا کر 6-6 ملین پونڈ کما چکے تھے اور سینئر کھلاڑیوں کو بھی تقریباً اتنی رقم دلوا چکے تھے۔ گویا وہ کرکٹ نہیں جوا کھیلنے گئے تھے۔۔ پہلے چار میچ انہوں نے پاکستان کو جتوانے کے لئے کھیلے اور تین میچ مال کمانے کے لئے حساب برابر ہو گیا۔ پاکستان فائنل میں پہنچ کر سرخرو ہو گیا اور کھلاڑی اپنی اپنی جیب گرم کر کے کامیاب واپس آ گئے۔ اس طرح دونوں ٹارگٹ پورے ہو گئے۔ اس کرکٹ سے ہمارے کھلاڑیوں کے علاوہ جس کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا وہ ہے ہمارا ٹیلی ویژن۔ جس نے تمام اخراجات نکال کر ساٹھ ستر کروڑ روپے کما لئے۔ ایک طرف ہمارے کھلاڑی دھڑا دھڑ آؤٹ ہو رہے تھے تو دوسری طرف اشتہارات کی بھرمار تھی جس سے قوم دہری اذیت کا شکار ہوئی لوگ ایکشن ری پلے دس دس منٹ کے اشتہارات کے بعد دیکھتے اور اپنا سر پیٹتے رہے۔

وزیراعظم نواز شریف خود ایک اچھے کرکٹر ہیں۔ انہیں چاہئے کہ ہارنے والے تینوں میچوں کی ریکارڈنگ نکلوا کر دیکھیں کرکٹ کے ماہرین کو ساتھ بٹھائیں اور تجزیہ کرائیں کہ یہ ہماری ٹیم کرکٹ کھیل رہی تھی یا جوا ہو رہا تھا۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ کھلاڑی جان بوجھ کر آؤٹ ہو رہے تھے تو ایک مرتبہ اللہ کا نام لے کر ان تمام کھلاڑیوں کو فارغ کر کے قانون کے حوالے کر دیں۔ چند دن ان کو جیل میں بھوکا رکھیں۔ یہ سب خود قبول دیں گے۔ انتظار الحق اور نعیم اکرم کو گرفتار کر کے ان سے سختی سے پوچھ گچھ کریں۔ ساتھ ساتھ کراچی اور لاہور کے بکی کو گرفتار کر لیں۔ یہ ان کھلاڑیوں کے نام بھی بتا دیں گے جو ماضی میں بھی ان کے ساتھ میچ فکسنگ میں ملوث رہے ہیں۔ اس سے قوم کا غصہ بھی ٹھنڈا ہو گا اور ان کھلاڑیوں کو آئندہ قوم کے ساتھ مذاق کرنے کی جرات نہیں ہو گی۔ اگر ایسا نہیں کیا تو یہ کھلاڑی اور شیر ہو جائیں گے اور گلی کے لڑکوں کی ٹیم سے بھی ہارنے میں شرم محسوس

نہیں کریں گے۔

دوسرا اہم فیصلہ یہ کریں کہ ایک نئی ٹیم صرف نئے لڑکوں کی تیار کر کے اس کو جاوید میانداد کے حوالے کر دیں اور چار سال تک ان پر محنت کریں۔ انشاء اللہ اگلا ورلڈ کپ پاکستان ضرور جیت کر آئے گا اور ہمیں ان جواریوں سے بھی نجات مل جائے گی۔ جب بنگلہ دیش کی نومولود غیر تجربہ کار ٹیم دو میچ جیت سکتی ہے تو ہم نے تو چار میچ جیتے تھے جس میں اسکاٹ لینڈ جیسی نئی ٹیم بھی شامل تھی۔ ان چار میچوں کی بدولت ہم سیمی فائنل کھیلے۔ ان نئے کھلاڑیوں میں کم از کم قومی جذبہ ہو گا۔ محنت کریں گے اور اپنا اور ملک کا نام روشن کریں گے ان میں اس ورلڈ کپ کی شکست کا بدلہ لینے کا جذبہ بھی ہو گا۔ قوم کی دعائیں بھی ساتھ ہوں گی۔ جاوید میانداد کا تجربہ ہو گا۔ آخر ایک نہ ایک دن تو ان سینئر کھلاڑیوں کو ریٹائرڈ ہونا ہے تو کیوں نہ یہ فیصلہ آج ہی ہو جائے تا کہ ساری زندگی یہ کھلاڑی اس قبل از وقت ریٹائرمنٹ کی ذلت کو یاد رکھیں اور نئے کھلاڑی اس سے عبرت حاصل کریں۔

وزیرخزانہ صاحب' آپ یہ غیرضروری ٹیکس ختم کریں

موجودہ بجٹ میں پہلی مرتبہ مرکزی حکومت نے صوبائی ٹیکس یعنی چنگی' ضلع ٹیکس' ایکسپورٹ ٹیکس ختم کر کے یقیناً تاجروں کے دیرینہ مطالبات مان کر عقلمندی کا ثبوت دیا ہے اور مرکز نے اپنی جیب سے صوبائی حکومتوں کو ہونے والی بلدیاتی آمدنی کا کچھ حصہ دینے کا بھی اعلان کیا ہے۔ کیونکہ یہ بلدیاتی ٹیکس تاجروں پر عذاب بن چکے تھے۔ شروع شروع میں چنگی کے نام پر معمولی بلدیاتی ٹیکس لگایا گیا جو صرف وزن پر وصول کیا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ چنگی کے ٹھیکیداروں نے یہ ٹیکس بلدیہ کے کرپٹ افسران سے مل کر کہیں کہیں وزن پر اور یا پھر کہیں قیمتوں پر وصول کرنا شروع کر دیا اور یہی بس نہیں کیا اضافی ضلع ٹیکس بھی عائد کر دیا۔ جب عوام نے اس کو بھی قبول کر لیا تو ایکسپورٹ ٹیکس کے نام پر بھی بلدیاتی ٹیکس وصول کیا جاتا رہا ہر علاقے کے الگ الگ ٹیکس ریٹ مقرر تھے۔ صوبہ سندھ کی بلدیات کے ٹیکسوں اور چنگیوں کے نرخ دوسرے صوبے کے مقابلے میں بھی الگ تھے حتیٰ کہ ہر شہر اور گاؤں کے باہر عمارتوں اور مقامات پر یہ ٹیکس ہر گزرنے والے ٹرک' مال بردار گاڑیوں سے زبردستی وصول کیا جاتا تھا اور اپنی مرضی سے کئی کئی گنا ریٹ بڑھا کر وصول کر لیا جاتا تھا۔ اگر کوئی اعتراض کر دیتا تو بس قیامت آ جاتی اور ان ٹھیکیداروں کے غنڈے دو دو دن تک روک لیتے تھے اور آکٹرائے انسپکٹر بھی ان سے ملے ہوئے تھے اور اگر جائزہ لیا جائے تو بہت سے ٹھیکیدار چنگی' ضلع ٹیکس' ایکسپورٹ ٹیکس وصول کر کے بھی ان انسپکٹروں سے مک مکا کر لیتے تھے۔ کیونکہ بلدیاتی انتخابات بہت عرصہ تک معطل رہے اور سندھ میں تو آج بھی یہ انتخابات نہیں ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے یہ ٹھیکیدار اور افسران مل کر تاجروں کو لوٹتے رہے۔ کوئی داد فریاد نہیں سنی جاتی تھی۔ موجودہ حکومت نے اس کا نوٹس لیا اور اس بجٹ میں اس کو ختم کر دیا۔ یہ کریڈیٹ وزیر خزانہ کو جاتا ہے کہ انہوں نے اس جبری ٹیکس کو جو انگریزوں کی اپنی نوآبادی کے لئے تھا' ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ مگر صرف اس ٹیکس کے ختم کرنے سے کام نہیں بنے گا تاجروں اور عوام کو بہت سے دیگر غیرضروری

ٹیکسوں سے بھی نجات دلانا ہوگی۔ ان میں ہر ہر قدم پر سینٹرل ایکسائز ٹیکس کی وصولی بھی عوام پر گراں گزرتی ہے اور درحقیقت مہنگائی کی اصل وجہ تاجروں کا منافع نہیں ہے بلکہ امپورٹ پر سینٹرل ایکسائز ڈیوٹی کے علاوہ ہر مرحلہ پر دوبارہ اور کہیں کہیں تین تین مرتبہ اس ڈیوٹی کا وصول کیا جانا ہے۔ خام مال پر پھر پیکنگ پر' پھر آخری مرحلہ میں تیسری مرتبہ یہ ڈیوٹی ہر چیز کی قیمت میں غیرضروری اضافہ کرتی ہے جس کا بوجھ عوام پر پڑتا ہے لہٰذا اس کو صرف کسی بھی ایک مرحلے پر وصول کرنا چاہئے نہ کہ بار بار وصولیابی کی جائے۔ اسی طرح اقراء سرچارج جو اربوں روپے کی شکل میں ہر سال وصول کیا جاتا ہے کیا ہم اس کو تعلیم پر خرچ کر رہے ہیں؟ آج تمام سرکاری اسکول کھنڈر بنے ہوئے ہیں۔ ہمارے مستقبل کے معمار ٹاٹوں اور ٹوٹے پھوٹے فرنیچروں پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اسکولوں کے نام پر ہزاروں عمارتیں کاغذوں پر بن چکی ہیں۔ ان میں کاغذی ٹیچر تنخواہیں بھی وصول کر رہے ہیں۔ اگر غیر سرکاری اسکول اور کالج نہ ہوتے تو ہمارا تعلیمی معیار اتنا گر چکا ہوتا کہ ڈگریاں کاغذ سے زیادہ اہمیت کی حامل نہ ہوتیں۔ لہٰذا اقراء سرچارج بھی ختم ہونا چاہئے۔ اسی طرح جائیداد ٹیکس کی شرح بڑھا بڑھا کر دس فیصد کر دی گئی ہے جس کا کوئی جواز نہیں کیونکہ پہلے ہی جائیدادوں کی قیمت میں کئی کئی سو گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ جتنے کی پہلے جائیداد ملتی تھی اب اس سے بھی کئی گناہ زیادہ اس پر ٹکٹ لگ جاتا ہے۔ آخر یہ پیسہ کہاں جاتا ہے جبکہ سڑکیں ٹوٹی پڑی ہیں۔ پینے کا پانی میسر نہیں ہے۔ سیوریج کے نظام کی حالت سب کو معلوم ہے۔ اور گرمی شروع ہوتے ہی لائٹ کا غائب ہونا روزمرہ کا معمول بن چکا ہے جبکہ چھتیس قسم کے مرکزی اور صوبائی ٹیکس دینے کے باوجود عوام بنیادی ضرورتوں سے محروم ہیں۔ ہمیں اس کا جائزہ لینا چاہئے کہ ہم کم سے کم عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ ڈالیں اور زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کریں۔ اس سے زیادہ کیا مذاق ہوگا کہ مشرقی پاکستان کے سیلاب زدگان کے لئے پیٹرول پر ایک روپیہ فی گیلن ٹیکس لگایا گیا تھا وہ آج بھی وصول کیا جا رہا ہے جبکہ مشرقی پاکستان کو ختم اور بنگلہ دیش بنے آج اٹھائیس سال ہو چکے ہیں۔ کوئی حساب لگائے کہ ہم ان 28 سالوں میں پیٹرول پر کتنا ٹیکس حکومت کو دے چکے ہیں اور شاید قیامت تک دیتے رہیں گے۔ اس بجٹ میں سب سے زیادہ تکلیف دہ ٹیکس ملازمین اور پروفیشنل افراد کے ٹیکس میں غیر معمولی اضافہ جو گہری تشویش کا باعث ہے ایک تو پہلے بھی ہمارے انجینئر' ڈاکٹر' وکلاء' کنسلٹنٹ' سائنسدان اس ملک میں نہیں ٹکتے اور باہر جا کر اپنی صلاحیتوں سے غیروں کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ اب اتنا زیادہ ٹیکس رہے سہے لوگوں کو بھی بھاگنے پر مجبور کر دے گا۔ ہمارے سائنسدان' انجینئر' ڈاکٹر بالخصوص بیرون ممالک میں بہت قابل سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح ایم بی اے کرنے کے بعد بیرون ممالک میں ان کی بڑی مانگ ہے۔ لہٰذا ان کو پرکشش تنخواہ

اگر نہیں دے سکتے تو کم از کم ان پر ایسے اضافی بوجھ تو نہ ڈالیں۔ اس پروفیشنل ٹیکس کو فوراً واپس لینا چاہئے۔ وقت آ گیا ہے کہ حکومت اپنے غیر ضروری اخراجات کم کرے۔ عوام کے ٹیکس پر اپنی عیاشیاں اور فضول خرچیاں ختم کرے۔ غیر ملکی دوروں پر کم سے کم لوگوں کو لے کر جائیں بڑی بڑی سرکاری عمارتیں بیچ کر اپنا خسارہ کم کریں۔ غیر ضروری اشیاء کی درآمدات کی حوصلہ شکنی کریں۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے کم سے کم قرضہ لیں۔ کوشش کریں کہ ڈکٹیشن نہیں لیں گے۔ قوم کو قرضہ سے نجات دلائیں۔ کیا ہم نے وزیراعظم سیکریٹریٹ' صدر' گورنر' چیف منسٹر ہاؤس فروخت کر دیئے ہیں؟ صرف سرکاری کارخانوں کی نج کاری تک کیوں محدود رہے۔ ان سے بڑے بڑے گھروں کے اخراجات کیوں ختم نہیں کئے۔ صرف شادی کے کھانوں پر پابندی سے سادگی اور اخراجات کم نہیں ہوتے بلکہ فضول خرچیوں کو ختم کرنے سے بھی سادگی آتی ہے اور اخراجات کم ہوتے ہیں۔ اس کے لئے ایک ٹیم تیار کی جائے جو غیر ضروری اخراجات کی نشاندہی کرے اور اس پر عمل درامد کرائے اور کلرک سے لے کر صدر تک اس کی پابندی اگر کریں گے تو ہم ان قرضوں سے نجات حاصل کر سکیں گے۔ ورنہ ہمارے بچوں کا مستقبل تاریک رہے گا کیونکہ ہر قرض دار کا مستقبل تاریک ہوتا ہے۔

بول کارگل بول' کشمیر ہمارا ہے

وزیراعظم نواز شریف عجلت میں امریکی صدر کلنٹن سے ملاقات کے لئے جب روانہ ہوئے تو یہ محسوس ہوا کہ پاک بھارت تعلقات کشیدگی کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں اور غالباً امریکی صدر نے دونوں وزراء اعظم کو امریکہ بلا کر مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے ثالثی کی پیشکش کی ہوگی۔ مگر جب صرف وزیراعظم نواز شریف نے صدر کلنٹن سے ملاقات کی تو امریکی اعلامیہ کے مطابق یہ ملاقات ہمارے وزیراعظم کی درخواست پر غیر سرکاری ملاقات تھی البتہ اتوار اور قومی دن کی مصروفیات کے باوجود صدر امریکہ نے اپنی دیگر تقریبات کو مختصر کر کے آدھے گھنٹے کی تاخیر سے وزیراعظم محمد نواز شریف سے تقریباً ڈھائی گھنٹے ملاقات کی جس میں آدھا گھنٹہ کی ون ٹو ون ملاقات بھی شامل تھی۔ اس ملاقات کا ایجنڈا غالباً کشمیر سے زیادہ کارگل میں مجاہدین کی پیش قدمی سے پیدا ہونے والی صورت حال پر قابو پانا تھا۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کا موقف مسئلہ کشمیر کا حل تھا جبکہ بھارت' کارگل پر قبضے کا' جس پر اس نے ان دنوں زبردست واویلا مچایا ہوا ہے تدارک کرنا تھا دوسری طرف وزیراعظم واجپائی نے یہ اعلان کر کے نہ صرف پاکستان بلکہ عالمی برادری کو حیرت میں ڈال دیا کہ ہم نہ امریکی ثالثی کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہی وہ امریکہ جانے کے خواہاں ہیں۔ گویا اگر پاکستان اور امریکہ کوئی فیصلہ کر بھی لیں تو بھارت اس کو تسلیم نہیں کرے گا۔ مگر پھر بھی جب سترہ لائن کا اعلامیہ جاری ہوا تو اس میں مسئلہ کشمیر کو معاہدہ شملہ کے مطابق حل کرنے پر زور دیا گیا اور 1972ء والی لائن آف کنٹرول کو تسلیم کر کے ہی مسئلہ کشمیر کے حل کرانے کے لئے امریکی صدر کی کوششوں کی پیشکش کی گئی۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر بھارت کشمیر کے مسئلے کو معاہدہ شملہ کے مطابق حل کرنے کے لئے راضی ہوتا تو ستائیس سال سے یہ معاملہ جہاں کا تہاں کیوں ہے؟ اور اب اچانک جب مجاہدین نے کارگل پر طوفانی قبضہ کیا تو بھارت کو کنٹرول لائن آف 1972ء کے مطابق یعنی سیاچن کا وہ علاقہ جس پر بھارت نے 1984ء میں قبضہ کر لیا تھا۔ اس علاقہ سے واپسی ہمارے مجاہدین کی

کارگل سے واپسی سے مشروط کردی گئی۔یعنی بھارت جس نے سیاچن پر سنہری خواب دیکھ کر 1984ء میں قبضہ کرلیا تھا۔اس علاقہ سے واپسی ہمارے مجاہدین کی کارگل سے واپسی سے مشروط کردی گئی یعنی بھارت نے سیاچن پر سنہری خواب دیکھ کر 1984ء میں قبضہ کیا تھا وہ اس کے لئے پورس کا ہاتھی بن چکا تھا جس پر تقریباً 8 سے دس کرور روپے یومیہ خرچہ تھا۔اگر حساب لگایا جائے تو گزشتہ پندرہ سال میں بھارت نے سیاچن میں پانچ سو کھرب روپے خرچ کر ڈالے ہیں مگر کوئی فائدہ نہیں اٹھایا سینکڑوں قیمتی جانوں کا زیاں مستزاد ہے۔یہ سیاچن اب اس کے گلے کی ہڈی بنا ہوا ہے جس سے وہ جان چھڑانا چاہتا تھا اور پسپائی کی بے عزتی بھی اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔اس پاک امریکہ اعلامیہ کی آڑ میں اپنی فوج کو واپس بلالے اور پاکستان ان مجاہدین کو جو کشمیر کی شہ رگ تک پہنچ چکے ہیں' ایک مرتبہ پھر اس اہم چوکی کو خالی کر کے مسئلہ کشمیر کو اس کے حل سے دور کردیا اسے اتفاق کہیں گے یا کچھ اور گزشتہ نصف صدی میں کئی مواقع ایسے آئے جب مسئلہ کشمیر حل کے قریب تھا کہ اچانک ہی دوبارہ زیرو پوائنٹ پر آ گیا سب سے پہلے پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان نے دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا تھا' جنگ روک دی اور کشمیر آتے آتے رہ گیا۔پھر شیخ عبداللہ کو پنڈت نہرو نے پاکستان بھیجا تو پنڈٹ نہرو کی اچانک موت کی وجہ سے یہ مسئلہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا۔اس کے بعد 1965ء کی جنگ میں یحییٰ خان نے چھمب جوڑیاں پہنچ کر پیش قدمی روک دی اگر یہ پیش قدمی جاری رہتی تو ہم کشمیر میں داخل ہو جاتے معاہدہ تاشقند میں ہم نے میدان جنگ کی فتح کو مذاکرات کی میز پر شکست سے بدل دیا۔اس وقت کے بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری ہاری ہوئی جنگ کو تاشقند کی ٹیبل پر جیتنے کی خوشی برداشت نہ کر سکے اور اسی رات سورگیاشی ہوئے۔

آخری معرکہ 1971 کی جنگ میں تو کشمیر کو پانے کے بجائے ہم نے آدھا ملک گنوا دیا۔تب جا کر یہ کنٹرول لائن کا نفاذ ہوا۔اس وقت بھارتی ذرائع ابلاغ بالخصوص زی ٹی وی اور دور درشن نام نہاد پہاڑی مورچوں پر دوبارہ قبضے کی فلمیں دکھا دکھا کر قوم کا مورال بڑھا رہے ہیں پورا بھارت حالت جنگ میں دکھایا جا رہا ہے جبکہ ہماری کارگل فتح کے باوجود ٹی وی پر کوئی خاص پروپیگنڈہ نہیں ہو رہا ہے۔عوام خود قیاس آرائیاں کر رہے ہیں۔اور باون (52) سال گزر چکے ہیں۔نہ اقوام متحدہ (UNO) کو توفیق ہوئی اور نہ ہی بھارت کو اس مسئلہ سے کوئی دلچسپی رہی تھی۔حالانکہ اس کی پانچ ڈویژن فوج کشمیر میں لگی ہوئی ہے۔اس کے بھاری اخراجات بھارت برداشت کر رہا ہے۔پھر اچانک ان مجاہدین کی عظیم الشان کامیابی جسے مغربی مبصرین پرل ہاربر کے بعد سب سے بڑی فتح قرار دے رہے ہیں ہم کیوں اس امریکی جال میں پھنس کر کشمیر ہمیشہ ہمیشہ کے

لیے بھارت کے دامن میں ڈال کر خود بھارت کو سیاچن سے اتارنے پر بغلیں بجانا چاہتے ہیں۔یہ نہ صرف کشمیریوں کے ساتھ غداری ہوگی بلکہ ہماری قومی غیرت اور مسلمان کی جہاد سے مایوسی کا سبب بنے گی۔امریکی صدر کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ یک طرفہ ثالثی کرے اس مرتبہ مسئلہ کشمیر کے حل تک پہنچے بغیر کوئی فیصلہ نہ قوم تسلیم کرے گی اور نہ ہی کشمیری۔لہذا وزیراعظم صاحب۔آپ واپس آ کر پہلے اپوزیشن کو اعتماد میں لیں۔کیونکہ کشمیر کے مسئلے پر اس وقت بھارت میں اپوزیشن اور وزیراعظم واجپائی میں دوراہیں ہو چکی ہیں۔کانگریس اس کو الیکشن اسکینڈل قرار دیتی ہے۔جبکہ خدا کا شکر ہے کہ ہماری اپوزیشن نے باوجود اس کے کہ اس کے حکومت کے ساتھ اچھے تعلقات نہیں ہیں۔کشمیر پر اپنی پوری حمایت کا یقین دلایا ہے کہ پارلیمنٹ میں کھل کر بات کریں۔قوم کو صحیح صورت سے آگاہ کریں۔آپ کی امن کوشش برحق مگر دشمن کو دشمن سمجھ کر جو بار بار دھوکہ دے کر جال توڑ چکا ہے۔اس دفعہ اس کو جال سے نہ نکلنے دیں اور ہرگز کارگل کا مورچہ نہ خالی کروائیں ان مجاہدین کو نہ چھیڑیں اب یہ جانیں اور بھارتی فوج۔انشاءاللہ فتح حق کی ہوگی۔جو ذلت اللہ تعالی نے ان نوجوان مجاہدین کے ہاتھوں بھارت کو دی ہے وہ کلنک کا ٹیکہ لگا رہنے دیجئے۔یہ کارگل کشمیر کی فتح سے کسی طرح کم نہیں۔صرف دس دن کا اور انتظار کرلیں۔انشاءاللہ سیاچن میں بارش کا پہلا قطرہ آزادی کشمیر کی نوید سنانے کے لیے بیتاب ہے۔آپ قوم کے حوصلے اور فوج کے جذبے پر اعتماد کیجئے۔انشاءاللہ کشمیر ہمارا ہے ہمارا ہی رہے گا۔

گورنر صاحب اب زیادہ دیر نہ کیجئے

سندھ میں کافی تبدیلیاں ظہور پذیر ہو چکی ہیں۔ سب سے پہلے گورنر معین الدین حیدر کو صوبہ میں امن وامان کی صورت حال بہتر بنانے کے بعد فارغ کر دیا گیا۔ سندھ میں حالیہ سیلاب کے سلسلے میں سابق گورنر صاحب نے دن رات دورے کیے اور موقع پر ہی سیلاب زدگان کی بھرپور مدد بھی کی۔ اور ان کی حقیقی آبادکاری کا بھی منصوبہ بنایا اور کافی نیک نامی کمائی۔ ان کی جگہ تاجر برادری سے تعلق رکھنے والے ممنون حسین کو نیا گورنر نامزد کر دیا گیا ہے۔ دو ہفتے گزر چکے ہیں۔ مگر ابھی تک وہ خیر سگالی کی دعوتیں وصول کر رہے ہیں۔ اتفاق سے سابق گورنر صاحب کی سبکدوشی سے چند روز قبل جب راقم جمیعت پنجابی سوداگران دہلی کے وفد کے ہمراہ سیلاب زدگان کے امدادی فنڈ میں پچیس لاکھ روپے کا چیک دینے کے لیے گیا تھا تو انہوں نے امن کی بحالی کے بعد بجلی کی بحالی شہر کی ٹوٹی پھوٹی سڑکوں کی فوری مرمت۔ کراچی میں پانی کے ٹینکر مافیا کا خاتمہ اور پانی کی فراہمی کے نئے نظام کی بحالی۔ سیوریج لائنوں کی صفائی وغیرہ اپنی نگرانی میں کرانے کو اپنی ترجیحات قرار دیا تھا۔ اب گورنر صاحب تبدیل ہو گئے ہیں۔ شہریوں کو اپنے نئے گورنر سے بڑی توقعات ہیں۔ کیونکہ وہ عوامی شہرت کے حامل ہیں۔ اور کراچی شہر کے باسی ہونے کے ناتے کراچی کے مسائل سے بخوبی واقف ہیں اور سیاسی اور سماجی تنظیموں میں رہ کر وہ یقیناً ان مسائل کو حل کرانے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو یقیناً کراچی کے شہری سکون کا سانس لیں گے۔ اور مسلم لیگ کی حکومت فعال ہوگی۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ گورنر صاحب اپنی ترجیحات پر عمل درآمد کرانے میں کس قدر کامیاب رہتے ہیں۔ بعض لوگوں کے خیال میں گورنر صاحب کسی خاص مشن کی تکمیل کے لیے لائے گئے ہیں۔ کیونکہ ایک طرف صوبے کے مسائل ہیں تو دوسری طرف مسلم لیگ کی حکومت کی بحالی ہے۔ اس وقت صوبے میں اسمبلی بھی بحال ہے اور گورنر راج بھی ہے ساتھ ساتھ وزیراعظم کے صوبائی مشیر غوث علی شاہ کی تقرری بھی ہو چکی ہے۔ وہ خصوصی طور پر سیاسی حکومت

کی بحالی کے ذمہ دار بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اگرچہ وہ ماضی میں اس صوبے کے وزیراعلیٰ بھی رہ چکے ہیں مگر امن وامان کی بحال کرنے میں ناکام رہے تھے ان کے دور میں سہراب گوٹھ آپریشن اور سانحہ علی گڑھ کالونی جس میں آٹھ گھنٹے تک نہتے شہریوں کا قتل عام ہوتا رہا۔ اور پولیس تماشا دیکھتی رہی۔ پھر اورنگی ٹاؤن میں بلوے ہوتے رہے۔ اور کراچی کے شہریوں کا قتل عام معمول بن گیا تھا۔ بشریٰ زیدی سانحہ اس کی سب سے پہلی کڑی تھی۔ جس کے بعد مہاجر پٹھان اور پھر مہاجر سندھی فسادات ہوئے اور آخر میں پنجابی مہاجر فسادات ہوئے۔ گویا کہ فسادات کا دور دورہ رہا جو کراچی سے نکل کر اندرون سندھ تک پھیل گئے۔ صوبے کے باشندوں کے جان و مال غیر محفوظ تھے۔ کرفیو روزمرہ کا معمول بن گیا تھا۔ ایک علاقہ میں فساد ختم ہوتا تھا تو دوسرے علاقے میں شروع ہو جاتا تھا۔ ہر طرف پولیس اور کرپشن عروج پر تھا۔ انتظامیہ ناکام ہو چکی تھی۔ حتیٰ کہ بلدیاتی ادارے بھی غوث علی شاہ کے دور میں توڑ دیئے گئے تھے۔ صرف ضیاء الحق کے منظور نظر ہونے کی وجہ سے ان کا دورانیہ طویل رہا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس نئے ٹارگٹ میں جوان کو وزیراعظم نواز شریف نے سیاسی حکومت کی بحالی کے لئے دیا ہے، وہ کس قدر کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ بظاہر اس وقت اپوزیشن مضبوط اور متحد ہے اور ہارس ٹریڈنگ کی گنجائش کم نظر آ رہی ہے۔ سیاسی توڑ پھوڑ ہوگی انسانوں کی منڈی لگے گی۔ کہیں پلاٹوں پر کہیں نوٹوں کی بارش سے ادھر والے ادھر اور ادھر والے ادھر آئیں گے۔ کہیں نہیں پولیس اور انتظامیہ کی مدد لی جائے گی۔ کیونکہ وزیراعظم کے مشیر غوث علی شاہ صاحب نے پہلے ہی دن بیان دیا تھا کہ وہ اپنے تمام صوابدیدی اختیارات استعمال کریں گے۔ ان کا اشارہ غالباً اپوزیشن کو خریدنے اور مسلم لیگ کی حکومت کی بحالی کا ہے۔ اس کے لئے وہ تمام جائز ناجائز اختیارات استعمال کرنے کے لئے مشہور ہیں۔ صرف امن وامان کی صورت حال بہتر ہے کہ مگر کاروبار زبردست مندی کی طرف مسائل ہے۔ صوبے میں نئے کارخانے نہیں لگ رہے بلکہ کارخانے بند ہو رہے ہیں۔ جس سے بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ صوبے میں سرکاری نوکریاں پر تا حال پابندی ہے سیلاب زدگان ابھی تک غیر آباد ہیں۔ کراچی اور اس کے نواحی علاقوں میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے فصلیں خراب ہو رہی ہیں حب ڈیم کا پانی بھی ختم ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ سے شہری پانی کی بوند بوند کو ترس رہے ہیں۔ بجلی کا جانا روز کا معمول ہے صوبے میں سابق گورنر کے جاتے ہی پولیس راج دوبارہ زوروں پر ہے۔ جگہ جگہ پولیس نے دوبارہ جنگلے لگا کر شہریوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔ رشوت کا بازار گرم ہے اب پولیس کسی کو جواب دہ نہیں ہے۔

آخر میں گورنر صاحب سے گزارش ہے کہ وہ سابق گورنر سندھ کے ادھورے کاموں پر توجہ دیں اور

شہریوں کو اس عذاب سے نجات دلائیں۔ خوشامدیوں کے غول سے باہر آئیں۔ شہر کا دورہ کریں۔ امیر المومنین والا کردار ادا کریں۔ اگر آپ ہوٹر والی سرکاری گاڑی میں جائیں گے تو آپ کے جانے سے پہلے ہی حقیقت چھپا دی جائے گی۔ لہٰذا عام گاڑی میں عام شہری کی حیثیت سے ان غلطیوں کو دور کریں جو آپ کے مشاہدات میں گورنر بننے سے پہلے ہوتی تھیں۔ سرکاری دفاتر کا دورہ کریں۔ عوام کی تکالیف ان دفاتر میں جا کر دیکھئے اور سنیئے اور موقع پر دور کریں۔ ہر دفتر کے ساتھ اچھے اور مخلص لوگوں کی کمیٹیاں بنائیے تا کہ ان دفاتر کی کارکردگی بہتر ہو اور لوگوں کو محسوس ہو کہ ان کے اپنے ہی درمیان سے آنے والا گورنر ان کی تکالیف کو نہ صرف سمجھ رہا ہے بلکہ اس کا ازالہ بھی کر رہا ہے۔ بس اب زیادہ دیر نہ کیجئے۔

وزیر تعلیم کہاں ہیں

پاکستان ان چند بدقسمت ملکوں میں سے ایک ہے جہاں تعلیم کا معیار بڑھنے کے بجائے روز بروز گرتا جا رہا ہے۔ اور عام لوگوں میں اس بڑھتی ہوئی مہنگائی کی وجہ سے اپنے بچوں کو تعلیم دینے کے بجائے چھوٹی عمر سے ہی کاموں میں لگا کر روزگار حاصل کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ یعنی نئی نسل کو تعلیم دینے کے بجائے ان سے پیسے کمانے کا کام لیا جا رہا ہے کسی قوم کے لیے اس سے بڑا المیہ اور کوئی نہیں ہو سکتا یہ ظالم والدین پیسہ ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا میں ہم پر چائلڈ لیبر کا الزام لگا کر ہماری ایکسپورٹ کو ختم کرنے کی پالیسی پر عمل ہو رہا ہے۔ ہماری حکومتوں نے آج تک تعلیم کے لیے کچھ نہیں کیا۔ نہ شہروں میں بڑے بڑے اسکول کھولے اور نہ ہی نئی یونیورسٹیاں/ کالج بنائے سب سے برا کام پی پی پی کی پہلی حکومت کے دوران وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں تمام تعلیمی درسگاہوں کو قومیانے کا ہوا اور پاکستانی قوم کو تعلیمی میدان میں بہت پیچھے کر دیا گیا۔ پھر تعلیم کا قتل عام شروع ہوا۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا مزاج بھی سرکاری ہو گیا۔ اساتذہ بھی سرکاری ملازم ہو گئے۔ یہی اساتذہ جب نجی اداروں کے ماتحت تھے۔ اس وقت وہ دن رات محنت کر کے اچھے اچھے طالب علم پیدا کر کے اپنے اپنے اسکولوں اور کالجوں کے نام پیدا کرتے تھے۔ اساتذہ کی بہت عزت تھی اور طالب علم علاوہ چند فی صد کے باادب اور ہنر مند ہوتے تھے۔ انہیں تعلیم سے بے اندازہ لگاؤ تھا اپنے اپنے حلقہ احباب میں وہ نیک اور شریف تعلیم کے ہی حوالے سے جانے جاتے تھے خاص طور پر اسکولوں میں ایک ڈسپلن ہوتا تھا۔ شرارتیں اپنی جگہ مگر تعلیم کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ امتحانوں کے دنوں میں اساتذہ کمزور طالب علموں کو رات گئے تک پڑھاتے تھے۔ اور اسی طرح طالب علم دلچسپی اور انہماک سے امتحان کی تیاریوں میں مصروف نظر آتے تھے۔ ایک دوسرے سے نوٹس کے تبادلے اور پوری پوری رات امتحانات کی تیاریاں کرتے کھانے پینے تک سے غافل ہو جاتے تھے۔ مگر اچھے نمبر حاصل کرنے کے لیے

کھیل کود ملنا جلنا سب چھوٹ جاتے تھے۔ اور واقعی تعلیمی معیار روز بروز بڑھ رہا تھا کہ یکا یک تعلیم کو نظر لگ گئی۔ بڑے بڑے نامور نجی تعلیمی ادارے بہ یک جنبش قلم نجی سے سرکاری ہوگئے۔ اور پھر وہی حال ہوا جو ہر سرکاری ادارے کا ہوتا ہے۔ اساتذہ سرکاری انداز میں تعلیم دینے لگے۔ اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی کم سے کم اور پرائیوٹ ٹیوشن پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ اور جو طالب علم پرائیوٹ ٹیوشن نہیں لیتے ان کو طرح طرح کے بہانوں سے تنگ کیا جاتا۔ امتحانات کے پرچے بھی آؤٹ ہونے لگے اور پیسے لے کر امتحانات پاس کرانے کا چلن بھی اس دور میں عام ہوا۔ گویا کہ تعلیم نہیں کاروبار شروع ہوگیا۔ سرکاری اسکولوں میں گھپلے روزمرہ کا معمول بن گئے۔ اساتذہ پرنسپل سب اس میں رچ بس گئے۔ دوسری طرف طالب علم بھی تعلیم سے کم اور اپنی اپنی یونین میں زیادہ دلچسپی لیتے۔ پہلے نظریاتی اسٹوڈنٹس یونین ہوتی تھیں۔ یعنی کوئی لیفٹ کی سیاست کر رہا ہے تو کوئی رائیٹ کی سیاست میں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے والدین یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کا بچہ درسگاہ میں تعلیم حاصل کر رہا ہے مگر اکثریت ان طالب علموں کی تعلیم کم اور یونین بازی میں پیش پیش تھے۔ پھر حکومت وقت نے بھی اپنے استعمال کے لیے ان طالب علموں کو اسلحہ بھی دینا شروع کر دیا۔ دوسری طرف لسانی تنظیمیں بھی اپنے اپنے پرچم لے کر اس میدان میں کود پڑیں اور درسگاہوں میں ہر طرف پاکستان کے بجائے رنگ برنگے پرچم لہرانے لگے۔ اور ایک وقت آیا کہ تعلیمی مقابلے کے بجائے تخریبی مقابلے روز کا معمول بن گئے۔ اسکولوں اور کالجوں میں اسلحہ کے ساتھ ساتھ منشیات داخل ہوگئیں۔ جو بچے کل تک سگریٹ نہیں پیتے تھے وہ منشیات کے عادی ہوتے گئے۔ کسی نے بھی تعلیم کے لیے کچھ نہیں کیا۔ وزیر تعلیم آتے گئے اور جاتے گئے۔ اسکول ڈی نیشنلائز ہوئے کی۔ مگر عادتیں اساتذہ اور طالب علموں کون سنوارتا۔ کوئی روک ٹوک تو نہ تھی۔ اور نہ آج ہے ہمارے پڑوسی ملک نے غربت کے باوجود طالب علموں کو سیاست سے دور رکھا۔ آج وہ ہر میدان میں ہم سے آگے ہیں۔ سری لنکا جیسے غریب ملک میں آج تعلیمی شرح اٹھانوے فیصد ہے۔ ہندوستان میں ساٹھ فیصد سے بڑھ چکی ہے۔ ہم تیس سے گھٹ کر اٹھارہ فیصد پر آچکے ہیں۔ میں نے کالجوں اور اسکولوں کے بچوں سے پوچھا کہ تمہارے وزیر تعلیم کا کیا نام ہے مجھے ایک بچے نے بھی صحیح نام نہیں بتایا۔ خود ایک سال سے میں نے وزیر تعلیم کا کوئی بیان نہیں پڑھا نہ آج تک وہ سندھ کے کسی بھی کالج یا اسکول میں مہمان خصوصی کے طور پر آئے۔ وزیر اعظم جونیجو حکومت میں تعلیم کو فروغ دینے کے لیے 4% اقراء سرچارج لگایا تھا تاکہ نئے نئے اسکول اور کالج کھولے جائیں گے۔ اس مد میں اربوں روپے جمع ہوگئے اقراء سرچارج بھی 4% سے بڑھ کر 5% کر دیا گیا۔ مگر نہ تو نئے اسکول کھلے اور نہ ہی کوئی نیا کالج یا یونیورسٹی کھولنے کی کوشش کی گئی۔ وزارت تعلیم

نے خود کچھ نہیں کیا بلکہ فراڈ کر کے نام نہاد اسکول اور اساتذہ کی ملازمت کے نام پر ہر سال اربوں روپے ہضم کر کے اس کو بھی ایک کاروبار بنا رکھا ہے۔ دوسری طرف دوبارہ نجی ادارے اسکول اور کالج کھول کر حکومت کا کام آسان کر رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ چند ادارے اس وقت اپنے اپنے اسکولوں اور کالجوں سے ذہین طالب علم پیدا کر رہے ہیں۔ مگر محکمہ تعلیم ان سے تعاون کے بجائے ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ ان کے ہاتھ سے یہ کاروبار جائے۔

میری موجودہ وزیر تعلیم سے استدعا ہے کہ آپ میدان میں آئیں۔ عوام کے روپے جو انہوں نے اقراء کے نام پر دیے ہیں۔ اس رقم سے ہر چھوٹے بڑے شہر میں اسکول، کالج کھولیں اور ہمارے ان نونہالوں کو بے راہ روی سے دور رکھنے کے لیے جتن کریں۔ اگر آپ یہ نہیں کر سکتے تو نجی شعبے کے لیے تمام ٹیکس معاف کر دیں۔ اس کو صنعت کا درجہ دیں۔ جس طرح امریکہ، یورپ، جاپان، میں دنیا بھر کے لوگ پڑھنے آتے ہیں۔ ہر کاؤنٹی میں اپنے اپنے اسکول اور کالج یونیورسٹیاں بھری پڑی ہیں۔ تعلیم عام کریں۔ اقراء سرچارج بے شک آپ وصول کرتے رہیں۔ نجی شعبہ اس کی کمی پوری کر دے گا۔ ہر پاکستانی تعلیم حاصل کرے۔ جس طرح ہر شہری کا شناختی کارڈ رکھنا ضروری ہو چکا ہے۔ اسی طرح ہر شہری کے لیے تعلیم سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ہم اکیسویں صدی میں جا رہے ہیں۔ جو کمپیوٹر سے بھی بڑھ کر ایٹمی دور ہوگا۔ کب تک ہم اپنی قوم کو جاہل رکھیں گے ہر اسکول اور نجی کالج کے لیے ضروری قرار دیں کہ وہ 15% بچوں کو مفت تعلیم دے۔ تاکہ غریب عوام کے بچے تعلیم سے دور نہ رہیں اور جو نجی ادارہ اس کی پابندی نہ کرے اس کو بند کر دیا جائے۔ تعلیمی میدان میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ نجی ادارے سرکاری کالجوں اور اسکولوں کو گود لینے کا سلسلہ شروع کریں۔ ہمارے بینک، انشورنس اور تمام اداروں سے صوبائی تعلیمی ٹیکس ختم کر کے ان سے سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی سرپرستی کروائیں۔ آنے والا کل ہمارے جاہل بچوں سے بہت برا سلوک کرے گا۔ خود یہ بچے بھی اگر ہم نے ان کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں دی تو ہم کو معاف نہیں کریں گے۔

کرکٹ کے نئے چیئرمین کے نام کھلا خط

صدر پاکستان نے پاکستان کرکٹ کنٹرول بورڈ کو توڑ کر مجیب الرحمان کو ایڈہاک چیئرمین نامزد کر دیا جنہوں نے سابق چیئرمین کپتان وسیم اکرم، اعجاز احمد اور سلیم ملک کے خلاف میچ فکسنگ کے الزامات کی تحقیقات شروع کر دی ہے۔ موجودہ ایڈہاک چیئرمین نے آتے ہی کپتان وسیم اکرم، اعجاز احمد اور سلیم ملک کو معطل کر کے اگرچہ ایک اچھا اقدام کیا ہے مگر دیگر کھلاڑی انضمام الحق، معین خاں اور شاہد آفریدی جن کے نام بھی میچ فکسنگ میں لیئے جا رہے تھے۔ ان کے خلاف کوئی کاروائی نہ کر کے احتساب کے عمل کو مشکوک بنا دیا ہے یا تو کسی کھلاڑی کو معطل نہ کیا جاتا یا پھر ان تمام کھلاڑیوں کے خلاف جن کے نام جوئے میں ملوث ہونے کے مرکزی کردار کے طور پر لیے تھے۔ ڈسپلنری ایکشن لیا جاتا تو یقیناً بہتر ہوتا۔

سب سے پہلے سابق سربراہ خالد محمود کے خلاف الزامات کی فوری تحقیقات کرائی جاتی۔ کیونکہ موصوف ہی نے نہ صرف کپتان وسیم اکرم، اعجاز احمد اور سلیم ملک پر سے پابندی اٹھا کر انہیں دوبارہ ٹیم میں شامل کیا۔ بلکہ وسیم اکرم کو دوبارہ کپتان بھی بنوایا اور عامر سہیل، راشد لطیف کو ٹیم سے باہر ہی رکھا۔ اس سے ملزم کھلاڑیوں کے حوصلے بلند ہوئے اور شارجہ میں انہی موصوف کی وجہ سے ٹیم میں جاوید میانداد کے خلاف بغاوت ہوئی۔ کیونکہ جاوید میانداد کی موجودگی میں میچ فکسنگ ممکن نہیں ہو سکتی تھی۔ اور جو میچ فکس ہوا تھا۔ یعنی بھارت اور انگلینڈ کے خلاف وہ جاوید میانداد کی سینئر کھلاڑیوں پر سختی کی وجہ سے زیادہ مارجن سے نہیں ہو سکا تھا۔ اگرچہ پاکستان کو اس میں ہارنے سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ مگر وسیم اکرم اس سے مالی فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ کیونکہ بھارت اور انگلینڈ پر رقم زیادہ لگی ہوئی تھی اور اس وقت پاکستان کی ٹیم نمبر ''ون'' کی پوزیشن رکھتی تھی۔ خالد محمود نے ان کی نہ صرف سرپرستی کی۔ بلکہ میانداد کو شارجہ کپ جتوانے کے باوجود استعفے پر مجبور کر دیا اور میچ فکسنگ کی راہ کا یہ آخری کانٹا بھی نکل گیا۔

گذشتہ ورلڈ کپ کے دوران وسیم اکرم اور ان کے ساتھی پاکستان کے لیے کم اور ذاتی مفادات کے لیے زیادہ کھیلتے رہے۔ ہماری ٹیم دنیا کی مضبوط ترین ٹیم بن چکی تھی اور ناقابل تسخیر کہلانے لگی تھی۔ لیکن پہلا جھٹکا ہمیں بنگلہ دیش سے شکست کی صورت میں لگا پوری قوم تڑپ اٹھی مگر ہمارے کپتان نے مسکرا کر کہا ''ہم اپنے بھائی سے مارے ہیں'' انہوں نے یہ کہہ کر قوم کو لگے اس زخم پر نمک ہی تو چھڑکا تھا۔ ان کے اس مطمئن اور پرمسرت انداز سے قوم کے بچے بچے کو یہ یقین کر لینے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کہ یہ شکست دراصل بھائی کے ہاتھوں نہیں، بہن کے ہاتھوں ہوئی ہے جسے کچھ لوگ ''مایا دیوی'' کہتے ہیں کچھ ''چمک'' کے نام سے پہچانتے ہیں۔

نئے ایڈہاک چیئرمین کو ہمارا مشورہ ہے کہ بنگلہ دیش سے میچ کی ریکارڈنگ غیر جانبدار ماہرین کرکٹ کے ساتھ بیٹھکر دیکھیں، آغاز سے انجام تک پوری ٹیم کی کارکردگی مشکوک نظر آئے گی۔ آخر میں ہم ایڈہاک چیئرمین مجیب الرحمن پر، جو احتساب بیورو کے چیئرمین، سینیٹر سیف الرحمان کے بھائی ہیں یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ صرف چند کھلاڑیوں کی معطلی کافی نہیں، قوم اس سانحے کے تمام ذمہ داروں کو عبرتناک سزائیں پاتے دیکھنا چاہتی ہیں۔

یہاں ہم اس شرمناک واقعے کا تذکرہ کریں گے جس میں گذشتہ دنوں شارجہ کپ میں راشد لطیف کی غیر معمولی کارکردگی کے سبب پاکستان نے ایک میچ غیر متوقع طور پر جیت لیا۔ یہ میچ بھی فکس تھا اور کپتان وسیم اکرم اس کے لیے بھاری رقوم ایک بکی سے وصول کر چکے تھے۔ میچ جیت جانے کی صورت میں معاملہ ہی الٹ ہو گیا اور بکی اور وسیم اکرم میں رقم کی واپسی پر تنازع ہوا۔ بکی کو رقم واپس نہ ملی تو اس نے لاہور میں وسیم اکرم کے والد اور بھائی کو اغواء کر لیا اور وسیم اکرم کی جانب سے رقم کی ادائیگی پر انہیں چھوڑا تھا۔ جناب مجیب الرحمن سے مطالبہ کریں گے کہ وہ مذکورہ بکی کو، جسے کورٹ نے دو ماہ قبل باعزت بری کر دیا ہے۔ اسے سلطانی گواہ بنائیں اور ورلڈ کپ میچ فکسنگ سمیت ایسے تمام معاملات کی معلومات حاصل کریں اور اس گھناؤنے کاروبار میں ملوث تمام کھلاڑیوں سے کرکٹ کو پاک کر دیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو نہ صرف ٹیم کے دیگر کھلاڑی بلکہ نئے آنے والے کھلاڑی بھی اس سے عبرت حاصل کریں گے۔ اور ایسے واقعات میں ملوث نہ ہونگے۔

ہمارے پاس نئے کھلاڑیوں کی کوئی کمی نہیں انہیں موقع دیا جائے تو قوم کی توقعات پر پورا اترنے کی بھر پور صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں گے۔ لہذا انصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں اور کرکٹ جیسے شریفانہ کھیل کو جوا بنا دینے والے کھلاڑیوں سے کوئی رورعایت نہ کی جائے۔

یہ ہی ہماری سارک کانفرنس تھی

گذشتہ ہفتے پہلی سارک کانفرنس انٹرنیشنل برائے ادویات 26 جولائی تا 30 جولائی 99 منعقد کی گئی پروگرام کے مطابق کانفرنس کا افتتاح وزیراعظم نواز شریف کو کرنا تھا مگر آخری دن اعلان ہوا کہ وزیراعظم اپنی مصروفیات کی وجہ سے نہیں آسکیں گے وزیر صحت جناب جاوید ہاشمی ان کی نمائندگی کریں گے۔ مگر کانفرنس والے دن صبح بتایا گیا کہ وہ بھی مصروف ہیں اور نہیں آسکیں گے، اس لیے سیکریٹری صحت جناب حسن رضا پاشا نے کانفرنس کا افتتاح کیا ادویات کی کانفرنس سارک ممالک یعنی بھارت، نیپال، بھوٹان، مالدیپ سری لنکا، بنگلہ دیش اور پاکستان میں بننے والی ادویات کے تیار کنندگان کے لیے منعقد کی گئی تھی پاکستان اسکا میزبان تھا ۔اطلاعات کے مطابق اس موقع پر تمام رکن ممالک کی دواؤں کے اسٹال لگائے جانے تھے مگر حیرت آمیز طور پر پاکستانی ادویہ سازوں کے سواء اور ان میں بھی دو ملٹی نیشنل کمپنیوں کے علاوہ تمام کی تمام پاکستانی کمپنیاں تھیں کسی ملک کے دواساز اداروں نے اسٹال نہیں لگائے دوسری حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ پاکستان کے علاوہ دیگر تمام سارک ممالک کے کل تین مندوبین کانفرنس میں موجود تھے۔ بنگلہ دیش، بھوٹان، نیپال، بھارت اور مالدیپ سے نہ تو کوئی مینوفیکچرار اور نہ ہی کوئی خریدار آیا۔ صرف سری لنکا سے ایک مندوب آیا ایک نمائندہ چین نے بھیجا تھا۔ پانچوں دن اسٹیج سے ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے نمائندے اور پاکستانی وزارت صحت کے عہدیدران مقالے پڑھتے اور کانفرنس کی افادیت بتاتے رہے۔ یہ نوعیت کی عجیب کانفرنس تھی جس میں سارک ممالک کے جھنڈے تو لہراتے رہے مگر نمائندگی صفر تھی۔ پاکستان فارماسیوٹیکل مینوفیکچررز ایسوسی ایشن، جو پاکستان کی واحد نمائندہ ایسوسی ایشن ہے اس کے ارکان، حیران پریشان پانچ روز تک سارک ممالک کے نمائندوں اور خریداروں کا انتظار کرتے رہے اور اپنا احتجاج رجسٹر کراتے رہے اگرچہ وزارت صحت کے تمام ذمہ داروں بشمول ڈائریکٹر جنرل غیور ایوب، ڈرگ کنٹرولر ڈاکٹر رانہ چودھری، رؤف خالد، مقامی اسسٹنٹ

کنٹرولر تنویر احمد، عبدالسمیع اور احمد جان اور سیکریٹری صحت حسن رضا پاشا صاحب پیش پیش رہے اور کانفرنس کو کامیاب بنانے کی بھرپور کوشش کرتے رہے مگر سارک کے ارکان کی غیر حاضری سب کے لیے حیران کن تھی۔ پانچوں دن ناشتے، لنچ اور ڈنر کے علاوہ اس کانفرنس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ہاں کانفرنس کے پاکستانی منتظمین نے اسٹال ہولڈرز سے لاکھوں روپے وصول کر لیے یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ مالدیپ، بھوٹان اور نیپال میں دواسازی کا کوئی ادارہ موجود نہیں ہے پاکستانی دواساز اداروں کو یقین تھا کہ وہ ان ممالک کے ساتھ مشترکہ منڈی بنا سکیں۔ مگر ان ملکوں کی عدم دلچسپی حیرت انگیز ہی نہیں ہے بلکہ بعض شکوک وشبہات کو بھی جنم دی رہی ہے بنگلہ دیش میں چھوٹے چھوٹے دواساز کارخانے ہیں مگر پاکستان جیسی بڑی صنعت نہیں ہے بھارت کے حوالے سے معلوم ہوا کہ کارگل کی وجہ سے بھارتی دواسازوں کو ویزے نہیں ملے، اس وجہ سے وہ شرکت نہیں کر سکے سری لنکا کا واحد نمائندہ بھلا کیا کر سکتا تھا۔

حکومت کے ارباب اختیار کو اس کا سخت نوٹس لینا چاہیے اور اس اہم کانفرنس میں سارک ممالک کی عدم دلچسپی کی وجوہات کا پتہ لگانا چاہیے خصوصاً اس بات کا کہ کہیں یہ بھارت کی اندرونی سازش تو نہیں جس نے دیگر ممالک کو اپنی عدم شمولیت سے آگاہ کر کے پاکستان کو رسوا کرنے کی کوشش کی ہو۔ اگر تجزیہ کیا جائے تو سارک تنظیم آج تک کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکی یورپی ممالک نے مشترکہ تجارت۔ کونسل۔ اسمبلی۔ کرنسی ایک کر کے کامیابی حاصل کی خلیجی ممالک جی ای سی کے ذریعے اپنے مسائل حل کر رہے ہیں سارک کی کارکردگی ابھی تک صرف نشتند و گفتند و برخاستند تک ہے اور اب تک چھوٹی چھوٹی کانفرنسوں کے علاوہ سربراہان کی بڑی بڑی کانفرنسیں منعقد کر چکی ہے جن پر اربوں روپے خرچ ہو چکے ہیں مگر ابھی تک امید کی پہلی کرن بھی نہیں پھوٹی اور نہ ہی یہ جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی کہ ہمارے اس خطے کے کیا مسائل ہیں اور ہم کس طرح انہیں حل کر سکتے ہیں بھارت ہمیشہ مسئلہ کشمیر کو آگے کر دیتا ہے پاکستان اسکی ذمہ داری بھارت پر ڈالتا ہے۔ جب تک یہ دونوں ممالک سنجیدگی سے اس مسئلہ کا حل نہیں نکالینگے سارک کانفرنس ہوتی رہیں گی اور نتیجہ صفر ہی رہے گا صفر کے آگے دس صفر لگا لیجئے صفر ہمیشہ صفر ہی رہے گا۔ آج نہیں تو کل ہمیں احساس ہوگا کہ ہم کتنی بڑی غلطی دہرا دہرا کر اپنا اور اس خطے کا من خراب کرتے رہے ہیں۔ ذرا سوچیں پچاس سال پہلے فرانس اور انگلستان ایک دوسرے کے ازلی دشمن سمجھے جاتے تھے انگریزی بولنا فرانس میں گالی کے مترادف تھا مگر آج فرانس میں سب سے زیادہ زور انگریزی سیکھنے پر ہے کیونکہ ان ممالک نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ نفرت اور جنگ حماقت کے سوا کچھ نہیں اصل جنگ بھوک کے خلاف اور اقتصادی اور تعلیمی میدان میں کامیابیوں کے

حصول لے لیے لڑی جانی چاہئیں، جب ہی قومیں ترقی کرسکتی ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی اپنی کرنسی اور تجارت ایک دوسرے سے منسلک کردی ہیں۔اب وہ دوبارہ امریکہ۔خلیج۔سارک۔ایشین مارکیٹوں پر چھارہے ہیں اور ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کے بجائے اپنے اپنے داموں پر اپنا مال فروخت کرکے اپنی قوم کو فائدہ پہنچارہے ہیں۔ان کے پاس ایٹمی ٹیکنالوجی بھی ہے اور صنعتی ٹیکنالوجی بھی ہے سب ایک دوسرے کی سرحدوں کا احترام کرتے ہیں مگر ہم غربت میں مبتلا ہیں۔ایک دوسرے کے گریبانوں پر ہاتھ ڈالے ہوئے ہیں ہمارے عوام بنیادی سہولتوں پانی، بجلی، تعلیم، آلودگی سے پاک ہوا تک سے محروم ہیں ہمارا بال بال قرضوں میں جکڑا ہوا ہے۔ہمیں ابھی تک اپنے اصلی دشمن کا بھی پتہ نہیں ہے مگر ہم دونوں آج بھی۔آئی۔ایم۔ایف۔ ورلڈ بینک اور دیگر اور دینے والے اداروں کی شرائط پر قرضے لینے پر تلے ہوئے ہیں۔قوم کو غربت کی طرف دھکیل رہے ہیں اور ایٹمی طاقت بننے پر خالی ڈھول پیٹ رہے ہیں۔ہماری کرنسی دن بہ دن نیچے جارہی ہے آخر ہم کب تک اپنی قوم کو بنیادی ضرورتوں سے دور رکھیں گے بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں کے عوام جنگ نہیں چاہتے مگر کون ہے جو ہم کو پچاس سال گزرنے کے باوجود ایک دوسرے کا دشمن بنائے ہوئے ہے۔خدارا سارک ممالک اپنی سوچیں یورپی سوچ ہم آہنگ کرلیں ایک دوسرے کا احترام کریں اور اپنی اپنی قوم کو جہالت اور غربت سے نکالیں۔اپنے اپنے مسائل کچھ لو اور کچھ دو کے طریقے سے حل کریں ورنہ کانفرنسیں ہوتی رہیں گی اور ہم پھر غلطیاں دھراتے رہینگے قوم کے پیسے پھونکتے رہیں گے اور فائدہ انہی کو پہنچے گا جو نہیں چاہتے کہ سارک ممالک ایک ہوجائیں۔

امریکہ میں دو ہفتے

پچھلے ہفتے امریکہ جانے کا اتفاق ہوا۔ویسے تو آنا جانا رہتا ہے مگر اس مرتبہ 14 اگست قریب تھا اور پاکستان کے جشن آزادی کے جلوس کا بڑا شہرہ سنا تھا تو سوچا چلو اس سال ہم اپنے وطن عزیز پاکستان کی آزادی کا یہ جلوس اپنی آنکھوں سے دیکھ چلیں خصوصاً اس لیے بھی کہ 15 اگست بھارت کی آزادی کا دن ہے اور اس روز بھارتی باشندے بھی اپنی آزادی کا جشن مناتے ہیں ان کا جلوس بھی دیکھا جائے اور اس کا پاکستان کے جلوس سے موازنہ کیا جائے۔یہاں یہ بات بتاتا چلوں کہ امریکہ میں دنیا کی تقریباً ہر قوم آباد ہے اور ہر دوسرے تیسرے دن کسی نہ کسی ملک کا یوم آزادی منایا جاتا ہے مین ہٹن میں ان جلوسوں اور پریڈوں سے سیاح اور مقامی باشندے نہ صرف محظوظ ہوتے ہیں بلکہ اس سے انہیں متعلقہ ملک کی ثقافت، لباس اور رکھ رکھاؤ سے بھی آگاہی ہوتی ہے اس مرتبہ 14 اگست کو ہفتہ تھا اور 15 اگست اتوار اور یہ دونوں ہی دن چھٹی کے ہوتے ہیں لہٰذا امید تھی کہ دونوں دن ان پریڈوں اور جلوسوں میں گزرے گا۔مگر بہت تعجب ہوا کہ پاکستانی سفارت خانے نے 14 اگست کے حوالے سے کوئی پروگرام نہیں رکھا۔جبکہ اتوار کو ہندوستان نے اپنے جشن آزادی کی پریڈ اور طویل جلوس، رنگ برنگ جھنڈوں اور بڑے بڑے فلوٹوں سے امریکنوں کو متاثر کیا۔اس جلوس میں عورتیں، مرد بچے حتی بوڑھے بھی شامل تھے بڑی بڑی ہندوستانی کمپنیوں نے اس کے اخراجات برداشت کئے اور اپنے اپنے رنگ برنگے فلوٹوں سے اپنی مصنوعات کی نمائش کی اس جلوس کی قیادت میں مشہور فلم اسٹار گووندا، گلوکارہ آشا بھونسلے پیش پیش تھے نام تو اور بھی فنکاروں کے تھے مگر میں کسی اور کو نہیں دیکھ سکا پبلک تھی کہ ٹوٹی پڑ رہی تھی۔شام تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔بعد میں پتہ چلا کہ پاکستان اگلے اتوار کو اپنا جشن آزادی اسی مین ہٹن میں منائے گا مجھے کیونکہ واپس پاکستان آنا تھا۔اس لیے میں حسرت دل میں لیے واپس لوٹ آیا اسی وجہ سے پچھلے ہفتے کالم بھی نہیں لکھ سکا تھا۔امریکہ میں بہت سے پاکستانی بھائیوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا

ہے مگر اس مرتبہ کشمیر کی لڑائی کی وجہ سے ہندوستانی اور پاکستانی دونوں اپنی اپنی جگہ جوش وخروش کا مظاہرہ کررہے ہیں۔امریکہ ہی میں نہیں دنیا کے تمام دیگر ممالک میں ایک بڑی سچی اوراہم بات بتاتا چلوں کہ ہندوستانی اور پاکستانی ہی ایک دوسرے کے سب سے زیادہ قریب ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے ہیں۔چھٹی والے دن گھروں میں ایک دوسرے کی دعوت کا عام رواج ہے امریکنوں تک سے،جن کے ملک میں وہ رہ بس رہے ہیں۔تعلق علیک سلیک سے آگے نہیں بڑھتا ان کا کہنا ہے کہ ہمارے سیاست دانوں نے ہم کو ایک دوسرے سے دور رکر کھا ہے اور کشمیر کو فٹ بال کا کھیل سمجھ کر کھیل رہے ہیں اگر ہم دوست بن جائیں تو دنیا میں صنعتی انقلاب لا سکتے ہیں۔کیونکہ ہماری عوام انتہائی محنت کش ہیں ہیں اٹھارہ گھنٹے کام کر کے اپنے سستے لیبر کی وجہ سے ہم نہ صرف اپنے عوام کو غربت سے نجات دلا سکتے ہیں۔بلکہ اپنے سکے کو دوبارہ ڈالر کے برابر لا کر ان سے آنکھ ملا کر بات کر سکتے ہیں۔صرف ان دونوں ملکوں کی اپنی 125 کروڑ کی منڈی ہے جس سے کئی یورپ اور امریکہ بن سکتے ہیں۔مگر ہم اپنی تمام صلاحیتیں لڑلڑ کر ضائع کررہے ہیں۔ایک بہت بڑے ہندوستانی بزنس مین نے مجھے کھانے پر مدعو کیا۔اس کی فیملی ہندوستان میں ہے۔میں نے اس سے پوچھا کہ تم اپنے بہن بھائیوں کے لیے کتنا پیسہ بھیجتے ہو۔اس نے ہنس کر کہا، پہلے تو میں ہر مہینے خاصی رقم بھیجا کرتا تھا۔مگر اب بہت عرصہ سے بند کر دیا۔کیونکہ میں بڑی محنت کر کے ڈالر کماتا ہوں۔اور وہ آپس میں لڑلڑ کر مررہے ہیں۔تو کیوں نہ یہ بھوکے مرجائیں۔جب ان کو عقل ہی نہیں ہے تو میں اپنا ڈالر کیوں ضائع کروں اچھے ہمسائے سے اگر تم دوستی نہیں رکھ سکتے تو کم از کم لڑائی تو مت کرو۔یہاں دیکھو میری دعوت میں ہندوستانی فیملی بھی ہیں اور پاکستانی فیملیاں بھی مدعو ہیں۔ہمارا مرنا جینا امریکنوں کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔یہاں ہم ڈالر کمانے آئے ہیں۔ہماری زبان،کھانا پینا،رہنا سہنا ایک ہے تو ہم یہاں کیوں لڑیں امریکہ میں سب سے زیادہ مجھے جس چیز نے متاثر کیا وہ اصول ہیں جو اسلام نے ہمیں بتائے ہیں۔مگر ہم نے انہیں چھوڑ دیا اور امریکنوں نے اپنالیا۔مثلاً وہ جھوٹ نہیں بولتے۔جھوٹی گواہی نہیں دیتے خریدا ہوا مال اگر کسی کو پسند نہ آئے تو 30 دن کے اندر وہ رسید دکھانے پر واپس لے لیتے ہیں انسانوں کے ساتھ ہی نہیں جانوروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرتے ہیں۔اگر کوئی حادثہ ہو جائے تو وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ ایشیائی باشندہ ہے یا امریکن آناً فاناً اس کو اسپتال پہنچا دیتے ہیں۔اگر کسی کی نوکری ختم ہو جائے تو بے روزگاری الاؤنس دیتے ہیں مسلمانوں کو انہوں نے پوری مذہبی آزادی دے رکھی ہے جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں وہاں کاؤنٹی مسجدوں کے لیے پلاٹ دیتی ہے آپ آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی تہوار منا سکتے ہیں اس لیے کام کرنے والوں کو چھٹی دیتے ہیں دنیا کے تمام

ممالک کو امداد دیتے ہیں۔قرضے دیتے ہیں۔اپنے ملازمین میں کوئی امتیاز نہیں برتتے ایک ہی ٹیبل پر مالک اور نوکر بیٹھ کر کھاتے ہیں یعنی ہم مسلمانوں نے اسلام کے ان سنہری اصولوں کو پس پشت ڈال دیا جس کی وجہ سے آج ہم ان کے مقروض ہیں۔اسلامی سلطنتیں ختم ہوگئی ہیں۔ہم جہالت اور غربت میں گرفتار ہیں۔اسی طرح ایک پاکستانی دوست کے ہاں میں مدعو تھا۔اس نے مجھے ایک کونے میں لے کر جا کر درخواست کی کہ آپ اپنے کالم میں اس بات کا ضرور ذکر کریں کہ پاکستان میں جب کوئی بات ہوتی ہے وہ امریکن ایمبسی پر مظاہرہ کرتے ہیں اور ان کا جھنڈا جلاتے ہیں۔بھارت میں بڑے بڑے ٹی وی چینل سے ان مناظر کو دکھایا جاتا ہے۔جس کی وجہ سے امریکن کہتے ہیں ایک طرف ہمارے جھنڈے جلاتے ہو دوسری طرف ہم سے قرضے اور امداد بھی مانگتے ہو۔اس وجہ سے ہمارے سران کے سامنے جھک جاتے ہیں۔وہ اس کا بڑا برا مناتے ہیں۔اور ہم پر آوازے کستے ہیں۔حالانکہ ہم ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے ہیں۔اگر انہوں نے ہم پاکستانیوں کو امریکہ سے نکال دیا تو اس کا نقصان کس کو ہوگا۔کبھی یہ سوچا کہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف قسط بند کر دے اور ہماری تجارت پر پابندیاں لگا دے تو اتنی بڑی منڈی بھی ہمارے ہاتھ سے نکل کر دوسروں کے پاس چلی جائے گی۔لہذا ان جذباتی نعروں سے غریبوں کے پیٹ نہیں بھر سکتے بلکہ بھوک اور افلاس میں اضافہ کر سکتے ہیں۔پہلے ہی ہم پر دہشت گردی کا الزام ہے کیا ہم عراق اور لیبیا کی طرح اپنے بچوں کو روٹی اور دوا کے بغیر مرتا دیکھ سکیں گے؟ ہم کو دوست بنانے چاہئیں نہ کہ روز ہم ایک دشمن بنا رہے ہیں ہماری فارن پالیسی میں ضرورت کے لحاظ سے تبدیلی آنی چاہیئے۔عرب ممالک اسرائیل سے تعلقات بڑھا رہے ہیں۔تقریباً سب نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا ہے حتی کہ فلسطینیوں نے بھی تسلیم کر لیا ہے تو ہم کیوں اسرائیل سے بگاڑ پیدا کر رہے ہیں۔ہمارے تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے اسرائیل کو کوئی فرق نہیں پڑتا جبکہ پوری دنیا اس کو تسلیم کر چکی ہے ہم اس سے کیوں دشمنی پر تلے ہوئے ہیں؟ اس کی باتوں میں وزن تھا۔میں اس وقت جہاز میں بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ ہم کب اپنی قوم کو غربت اور جہالت سے نجات دلا سکیں گے۔

جشن آزادی یا یوم غلامی

اس سال ۱۴ اگست کو ایک مخصوص سیاسی سوچ رکھنے والوں نے یوم آزادی کے بجائے یوم غلامی کے طور پر منایا۔ یہ خبر میرے لیے بھی اتنی ہی تکلیف دے تھی جتنی کہ کسی محبِ وطن پاکستانی کے لیے ہوسکتی ہے ذہن اس خبر کے مضمرات میں الجھا ہوا تھا کہ جناب پروفیسر کریم بخش نظامانی کا مضمون نظر سے گزرا عنوان تھا'' ہے کوئی جو عبرت پکڑے!''

پروفیسر صاحب نے قیام پاکستان کے حوالے سے کئی تاریخ واقعات لکھے اور مقاصد پاکستان اور محرکات قیام پاکستان پر کھل کر بحث کی اور پرمغز دلائل دیتے ہوئے ہندوؤں' انگریزوں اور سکھوں کی ریشہ روانیوں کا ذکر کیا انہوں نے بتایا کہ پاکستان کے قیام کے لیے کیسی کیسی مشکلات سے سابقہ پڑا اور کیا کیا قربانیاں دی گئیں مگر افسوس کہ آج ہم اپنے اسلاف کی تمام تر کوششوں پر خود اپنے ہاتھوں سے خط تنسیخ پھیر رہے ہیں اور ان ہزاروں جانوں اور عصمتوں کی قربانیوں کا مذاق اڑا رہے ہیں، جو پاکستان کے قیام کے لیے دی گئیں۔

پروفیسر نے تو پچاس برس پہلے کے تاریخی حوالے دیئے مگر میں آج اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں کہتا ہوں کہ'' خدا کی قسم! پاکستان اللہ کا عظیم انعام ہے جو اس نے برصغیر کے مسلمانوں کی برسوں کی جدوجہد بیش بہا قربانیوں اور سب سے بڑھ کر آزاد وطن میں ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل کے وعدے پر بخشا پاکستان نہ ہوتا تو آج مسلمانان برصغیر انگریزوں یا ہندوؤں کے غلام ہوتے اور ہمیں آزادی کی قیمت کا اندازہ ہوتا۔

مجھے اپنے کاروبار کے سلسلے میں اکثر دیار غیر بھی جانا پڑتا ہے۔ بھارت، بنگلہ دیش، سری لنکا، خلیجی ممالک، یورپ، امریکہ اور دیار غیر جا کر ہی اپنے ملک، اپنے وطن کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے میں چند مثالیں پیش کرتا ہوں جن سے پاکستان کے خلاف ہذیان بکنے والوں کو، پاکستان کی حیثیت اور اہمیت کا اندازہ

ہو جائے گا۔ ایک مرتبہ پڑوسی ملک بھارت جانے کا اتفاق ہوا میرا قیام ممبئی میں' جو اس وقت بمبئی تھا کہلاتا تھا ایک رات بارہ بج چکے تھے مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی' سوچا کچھ دیر باہر چہل قدمی کرلوں۔ ہوٹل سے باہر آیا تو معمولی چہل پہل تھی' کیونکہ ہوٹل مین بازار میں تھا ابھی چند قدم چلا تھا کہ ایک عورت میرے سامنے آگئی پھٹے حالوں جسم انتہائی لاغیر مجھے تعجب ہوا کہ اتنی رات گئے بھی یہاں بھکاری موجود ہیں میں نے عورت کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر ایک روپیہ رکھ دیا چند مزید قدم چلا ہوں گا کہ سات آٹھ برس کا ایک بچہ اندھیرے سے نکل کر میرے سامنے آگیا اس کی حالت بھی بے حد خراب تھی۔ جسم پر واحد لباس نیکر اور بنیان تھا' ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ اچھی خاصی سردی میں یہ لباس مجھے کپکپی سی چڑھ گئی۔ میں نے اس کو ایک روپیہ دیدیا وہ سوچتا ہوا آگے بڑھ گیا اس موسم میں اتنی رات گئے یہ بھک منگا بچہ کہاں سے آگیا کسی خیال کے تحت پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ بچہ اسی عورت کے پاس کھڑا نظر آیا اور وہ عورت اپنے دوسرے سوئے ہوئے بچے کو جھنجھوڑ کر اٹھا رہی تھی تاکہ وہ بھی جائے اور مجھ سے بھیک وصول کرے۔ مجھے اس وقت اپنا وطن پاکستان یاد آیا کہ وہاں تو مغرب کے بعد کوئی بھکاری نظر نہیں آتا اور پھر یہ کہ ہمارے بھکاری تو بڑے ہٹے کٹے ہوتے ہیں اور اچھے خاصے کمانے والے لوگوں سے زیادہ کماتے ہیں اور ان کے بھیک مانگنے کے اوقات بھی دفتری اوقات کے ساتھ شروع اور ختم ہوتے ہیں جبکہ ممبئی میں جتنے بھی بھکاری دیکھے وہ نہایت کمزور ہڈیوں کا ڈھانچے کہ دل نہیں مانتا کہ ان کو خالی ہاتھ لوٹائیں اور ہر سگنل پر میں نے آٹھ آٹھ دس دس بھکاری عورتوں بچوں اور بوڑھوں کو ایک ساتھ رکنے والی گاڑی پر حملہ آور ہوتے دیکھا ان میں بیشتر ننگے بدن اور تمام کہ تمام اس قدر کمزور کہ آپ ان کی ہڈی پسلیاں تک گن لیں اکثر کے پاؤں میں جوتے تک نہیں تھے ممبئی ائیر پورٹ پر جب ہمارا جہاز لینڈ کر رہا تھا تو نیچے تا حد نگاہ گندی کچی آبادیاں نظر آرہی تھیں غربت کا یہ عالم کہ ہر سگنل پر جب ہماری ٹیکسی رکتی تو ڈرائیور گاڑی بند کر دیتا تاکہ پیٹرول کی بچت ہو سکے کیا ہم نے کبھی سگنل ڈاؤن ہونے پر اپنی گاڑی بند کی؟ ممبئی میں شاپنگ کے دوران ایک بہت بڑے ایکسپورٹر سے ملاقات ہوئی مجھ سے پوچھا کہ کیا میں پاکستان سے آیا ہوں، میں نے اثبات میں سر ہلایا اور پوچھا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ انہوں نے کہا کہ پاکستانیوں کے چہرے بڑے روشن اور صحت مند ہوتے ہیں۔ پھر انہوں نے اپنا تعارف کروایا کہ موصوف مسلمان تھے ان کا تعلق یوپی کے شہر مراد آباد سے تھا، جو ظروف سازی میں عالمگیر شہرت کا حامل ہے۔ ان کا بھی برتنوں کا کاروبار ہے اور یہ کاروبار ہندوستان بھر ہی میں نہیں پھیلا بلکہ وہ برتنوں کے بہت بڑے ایکسپورٹر بھی تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اس کے باوجود کہ کوٹھی بنگلہ افورڈ کر سکتے ہیں اور چاہیں تو امراء کی بستی میں اچھے سے اچھا گھر بنوا سکتے ہیں مگر' وہ

مراد آباد شہر کی ایک نسبتاً پسماندہ بستی میں رہنے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ ہندو مسلمان فساد جو اکثر ہوتے رہتے ہیں اس بستی میں محفوظ ہیں ہندوستان سے پاکستان جو آتا ہے وہ یہیں رہ جاتا پاکستان اور بھارت کے حالات کا اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ بھارت سے جو بھی یہاں آتا ہے' لوٹ کر جانا نہیں چاہتا اور بعض لوگ رک بھی جاتے ہیں مگر پاکستان سے بھارت جانے والا وہاں مستقل رکنے کا تصور بھی نہیں کرتا ایک بار بنگلہ دیش جانا ہوا تو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ تو وہی ڈھاکہ تھا جو سقوط ڈھاکہ کے وقت میں چھوڑ گیا تھا ۲۹ سال میں کچھ بھی تو تبدیل نہیں ہوا صرف چند عمارتیں نئی نظر آئیں البتہ جہاں پہلے ہزاروں رکشے چلتے تھے وہاں اب لاکھوں رکشے وہی ہاتھ والے چل رہے ہیں تھے اور یہ نتیجہ تھا غربت اور بے روزگاری کا سقوط ڈھاکہ سے پہلے موتی جھیل اور بیت المکرّم مسجد کا علاقہ اتنا کشادہ اور صاف ہوتا تھا جیسے ہمارا کلفٹن کا علاقہ ہے مگر آج موتی جھیل اور بیت المکرّم جو نا مارکیٹ کا نقشہ پیش کر رہا ہے گھریلو نوکر صرف روٹی کپڑے اور مکان کے عوض مل جاتے ہیں عید وغیرہ پر کچھ نقد ٹکہ مل جائے تو مل جائے۔ ایک بوڑھے بیورو کریٹ سے ملاقات ہوئی جو مغربی پاکستان میں اعلیٰ سرکاری افسر رہ چکا تھا میں نے اس سے پہلے اور اب میں فرق پوچھا تو اس نے ٹھنڈی بھری اور کہا کہ ہم نے پاکستان کی قدر نہیں کی۔ آج ہم غربت اور سیلاب میں گھرے ہوئے ہیں کاش وہ خوشحالی لوٹ آئے اور ہم ایک ہو جائیں اس وقت آٹا چاول ہر چیز سستی اور وافر مقدار میں ملتی تھی۔ مگر آج ہم موٹا چاول ہی خرید سکتے ہیں۔ صرف ٹیکسٹائل کی انڈسٹری نے کوٹہ نہ ہونے کی وجہ سے ترقی کی ہے باقی اللہ اللہ خیر صلا ہمارے نوجوان اور عورتیں دیار غیر میں نوکریاں کر کے اپنے کنبے پال رہے ہیں ہر دوسرے گھر سے کوئی نہ کوئی آدمی روزی کمانے کے لیے دیار غیر میں ہے جس کی وجہ سے دو وقت کی روٹی میسر ہوتی ہے قیام پاکستان کے وقت مغربی پاکستان میں چند سو بنگالی خاندان آباد تھے مگر اب لاکھوں بنگلہ دیشی پاکستان میں نوکریاں کر رہے ہیں کیا پاکستان سے بھی کوئی بنگلہ دیش نوکری کی تلاش میں گیا ہے؟

ہمارے ملک میں سری لنکا، بنگلہ دیش، برما' مالدیپ' افغانستان، نوآزاد رشین ریاستوں سے لوگ نوکریوں کی تلاش میں آتے ہیں۔ اکثر گھریلو ملازم انہیں ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیونکہ پاکستان ان سے زیادہ خوشحال ہے ایک مرتبہ جب میں این پی پی میں تھا تو جناب غلام مصطفےٰ جتوئی نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ پاکستان اللہ کی نعمت ہے۔ کیونکہ قیام پاکستان سے قبل تمام جاگیردار اور وڈیرے ہندو بنیوں کے مقروض تھے۔ ان کی جاگیروں کے کاغذات ان کے پاس گروی تھے جب یہ ہندو بھارت منتقل ہوئے۔ تب جا کر ان کے کاغذات واپس ملے اور ان سے نجات ملی یہی حال ہندوستان کے لٹے پٹے مسلمانوں کا تھا' وہ پاکستان آ کر مالا

مال ہو گئے جبکہ وہ قیام پاکستان سے قبل معمولی دکان یا معمولی نوکریاں کرتے تھے اور ہندو اور سکھ کاروبار پر چھائے ہوئے تھے۔ پاکستان کی بدولت آج وہ کئی کئی فیکٹریوں اور بنگلوں کے مالک ہیں اس خوشحالی پاکستان کی کیا کیا مثالیں دوں کاغذوں کا ڈھیر لگ جائے گا۔ قرآن میں جن جن نعمتوں کا ذکر ہے وہ تمام کی تمام الحمدللہ پاکستان میں موجود ہیں۔ یہاں کے پہاڑ، دریا' سمندر، درخت، فصلیں' ہمہ اقسام کے پھل اور سبزیاں کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ اتنی مہنگائی کے باوجود غذائی اشیاء دنیا بھر میں سب سے سستی اور تازہ شکل میں دستیاب ہیں۔

ایک نقشہ یورپ کا بھی کھینچ دوں جہاں اگرچہ ترقی ہی ترقی نظر آتی ہے مگر گھریلو نوکر چاکر یا ڈرائیور ایک فیصد افراد ہی افورڈ کر سکتے ہیں۔ کھانا کھا کر خود برتن دھوتے ہیں۔ اپنے کپڑے خود استری کرتے ہیں۔ گھر کا جو فرد کماتا ہے خود ہی خرچ کرتا ہے ایک پیسہ بھی اپنے والدین بہن بھائیوں پر خرچ نہیں کرتا اولاد جوان ہو کر والدین سے آزاد ہو جاتی ہے۔ والدین ان پر سختی بھی نہیں کر سکتے حتیٰ کہ میاں بیوی پر حکم نہیں چلا سکتا دونوں مل کر کماتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ مہنگائی کا یہ حال ہے کہ اگر آپ کسی پاکستانی یا ہندوستانی ریسٹورنٹ میں جائیں تو ایک روٹی 100 روپے میں ملے گی۔ ایک پلیٹ گوشت 300 روپے سے آٹھ سو روپے میں یعنی 5 پونڈ سے 10 پونڈ تک ملے گی ایک پونڈ 90 روپے کے لگ بھگ ہوتا ہے یہی حال سبزیوں اور دالوں کا ہے 300 سے 600 روپے میں ایک پلیٹ۔ ایک مرتبہ سوئٹزرلینڈ میں ایک ریسٹورنٹ میں گیا تین سموسے منگائے قیمت فی پلیٹ 250 روپے تھی۔ دوائیں اور ڈاکٹر اتنے مہنگے کہ اگر ان کی سوشل سیکوریٹی نہ ہو تو بندہ بل ادا کرتے کرتے دوسری دنیا میں چلا جائے گا۔ یہی حال سبزیوں اور پھلوں کا ہے اکثر پھل اور سبزیاں فروزن ملتی ہیں۔ تازہ گوشت کھانے کا رواج نہیں ہے ہر چیز پیک اور مہنگی ملتی ہے۔ اگر تازہ چاہیے تو کئی کئی گنا قیمت پر ملتی ہے اور اس کے لیے مخصوص علاقے میں جانا پڑتا ہے جبکہ ہمارے ہاں ہر چوک پر یہ تمام چیزیں دستیاب ہیں۔

ایک بات اور میں نے نوٹ کی جب ہم پاکستان سے باہر جاتے ہیں تو صرف پاکستانی بن جاتے ہیں اور جب واپس پاکستان آتے ہیں تو پھر پنجابی، سندھی، مہاجر، بلوچ، پٹھان بن جاتے ہیں ہم میں قومی جذبہ ابھی تک کیوں نہیں ابھرا ہے صرف 14 اگست کو جشن آزادی منانے سے ہم پاکستانی نہیں بن سکتے ہم کو سوچنا چاہیئے کہ پاکستان نے ہم کو کیا دیا ہے اور ہم نے پاکستان کو کیا لوٹایا ہے ہمارے ننھے منھے بچے 14 اگست کو چھوٹے بڑے جھنڈے لیے خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ پاکستان سے باہر رہنے والے بڑی چاہ سے جشن آزادی مناتے ہیں۔ ہماری ایمبسی اس کا خصوصی انتظام کرتی ہے، دیار غیر میں رہنے والے پاکستانی ہی

پاکستان کا دکھ درد جانتے ہیں ان کو اپنے ملک سے بڑی عقیدت اور محبت ہوتی ہے اگر سرراہ کوئی اجنبی پاکستانی کسی پاکستانی کو مل جائے تو دونوں نہ جاننے کے باوجود مل کر بڑے خوش ہوتے ہیں جو پاکستانی دیار غیر میں رہتا ہے سب سے پہلے پاکستان کے متعلق پوچھتا ہے کہ میرا پاکستان کیسا ہے اس کو بڑا دکھ ہوتا ہے جب ہمارے ملک میں فسادات، لوٹ مار، دہشت گردی کی خبریں سنتا ہے یا اخبارات پڑھتا ہے یا کوئی پاکستان کے خلاف بات کرتا ہے تو وہ مرنے مارنے پر تل جاتا ہے اس کا کہنا ہے کہ سیاست دانوں کی نادانیوں پر پاکستان کو کیوں برا بھلا کہتے ہو۔ یہ سب کچھ سیاست دانوں کا کیا دھرا ہے یہ مہنگائی بھی ہمارے حکمرانوں کی شاہانہ ٹھاٹ باٹ اور بیرونی قرضوں کی وجہ سے ہے جس کا تمام تر بوجھ بالآخر غریب عوام پر پڑتا ہے امیروں کو اس کی پرواہ نہیں ہے ہمارے حکمراں جب تک فضول خرچیوں کے لیے قرض پر قرض لیئے جائیں گے ہم مہنگائی کو روتے رہیں گے۔ مگر خدارا پاکستان کو برا مت کہو۔ اپنی آزادی کی قدر کرو ایک پرندے ہی کی مثال لو جس کو تم دن رات دانہ پانی دیتے ہو ہر چیز کا خیال رکھتے ہو مگر ایک لمحہ پنجرہ کھلا چھوڑ دو وہ پھر سے اڑ جائے گا۔ اور پلٹ کر بھی نہیں دیکھے گا۔ کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ غلامی کیا ہے اور آزادی کیا ہے اگر میری باتوں پر یقین نہ آئے تو چند دن دیار غیر میں جا کر رہ لو پاکستان یاد آنے لگے گا۔ اللہ ہم کو بھائی چارے اور ملک سے محبت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وزیر خزانہ صاحب! ایک نظر ادھر بھی

آج کی دنیا میں معیشت کا دارومدار پبلک لمیٹڈ کمپنیوں پر ہوتا ہے۔ جس ملک میں جتنی زیادہ پبلک لمیٹڈ کمپنیاں ہوں گی وہ ملک اتنی ہی ترقی کرتا ہے کیونکہ یہ عوام کے سرمایے کی نہ صرف رکھوالی کرتی ہیں بلکہ ان کو بھرپور منافع بھی دیتی ہیں۔ یورپ، امریکہ، جاپان، کوریا، سنگاپور، ملائشیا اور انڈونیشیا اس کی زندہ مثالیں ہیں جہاں عوام کا بیشتر سرمایہ انہی کمپنیوں میں لگا ہوا ہے۔ ہر کمپنی اب بڑے بڑے گروپوں میں تبدیل ہو چکی ہے جتنا بڑا گروپ ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ منافع دے گا کیونکہ اسی پر عوام زیادہ سے زیادہ بھروسہ کر کے ان کو سرمایہ فراہم کریں گے جس سے نئے نئے کارخانے بینک انشورنس وجود میں آتے ہیں۔ ملک کو زیادہ سے زیادہ منافع کے علاوہ ٹیکس اور روزگار فراہم ہوتے ہیں۔

حکومت عوام کے سرمائے کا تحفظ بھی کرتی ہے اور معمول کے مطابق ان کمپنیوں کی سرگرمیوں کی نگرانی بھی کرتی ہے۔ شاذونادر ہی کوئی کمپنی دیوالیہ ہوتی ہے یا زیر بار ہو جاتی ہے اگر کبھی ایسا ہوتا ہے تو مقامی بینک یا حکومت اس کمپنی کو ہنگامی امداد بھی فراہم کرتی ہے یا وہ پھر عوام سے اپیل کرتی ہیں تو عوام دوبارہ بھرپور سرمایہ کاری کر کے ان کو بحران سے نکال لیتے ہیں۔ حال ہی میں کوریا میں ڈائیو کمپنی بحران کا شکار ہوئی جس کی وجہ اس کمپنی کے چیئرمین کے کچھ غلط فیصلے تھے۔ عوام نے دوبارہ سرمایہ کاری کر کے ڈائیو کمپنی کو استحکام تو فراہم کر دیا مگر اس کمپنی کے چیئرمین کو فارغ کر کے انکوائری شروع کر دی گئی اب یہی چیئرمین بغیر کسی اختیار کے کام کر رہے ہیں اور جب رپورٹ آئے گی اور قانون کے مطابق اگر وہ ذمہ دار ٹھہرائے گئے تو ان کا بھی محاسبہ ہوگا۔

مگر ہمارے ملک میں اس قسم کی کوئی تحقیقات سرمایہ کاری کے حوالے سے نہیں ہوتی۔ خود سرکاری اور نیم سرکاری ادارے مسلسل خسارے میں چل رہے ہیں۔ میں نے اپنے طور پر کراچی اسٹاک ایکسچینج کا جائزہ لیا۔ اس وقت تقریباً 625 تجارتی کمپنیاں رجسٹرڈ ہیں جن میں کئی بڑے گروپ ہیں۔ یعنی کئی کئی شعبوں میں وہ کام کر رہے ہیں۔ تقریباً ان کے تمام ادارے خسارے میں چل رہے ہیں۔ عوام کا اربوں روپیہ ان کے اداروں

میں لگا ہوا ہے۔ شروع شروع میں انہوں نے کچھ منافع تقسیم کیا ہوگا جس سے عوام میں اعتماد آیا پھر وہ نئے نئے ادارے بناتے گئے۔ عوام سے سرمایہ کاری کرا کے اب وہ کئی سال سے کوئی منافع نہیں دے رہے ہیں اور ان کے شیئر کی قیمت ایک روپے سے بھی کم ہو چکی ہے یہ دن دھاڑے عوام کے سرمائے پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف ہے۔

625 اداروں میں سے 325 ادارے مسلسل خسارے میں چل رہے ہیں اور تین سو ادارے جن میں اکثریت غیر ملکی کمپنیوں کی ہے۔ وہ منافع کما بھی رہے ہیں اور تقسیم بھی کر رہے ہیں۔ خود عوام کا N.I.T. اور بینکرز ایکویٹی پر بھروسہ نہیں ہے۔ N.I.T. اپنے مقررہ نرخوں سے تیس سے چالیس فیصد تک کم داموں پر آ چکی ہے کیونکہ اس نے ایسی ایسی جگہ اور کمپنیوں میں سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ جو ڈوب چکی ہیں۔ N.I.T. کیش کرانے جائیں تو پندرہ پندرہ دن بعد پیسے ملتے ہیں۔ بینکرز ایکویٹی کا شیئر صرف 4 روپے 50 پیسے یعنی 55 فیصد کم ہو چکا ہے۔ اس میں بہت بڑے بڑے فراڈ ہوئے ہیں اور اربوں روپے کے قرضے مک مکا کر کے معاف کر دیئے گئے ہیں۔ عوام کے پیسے ڈوبے ہوئے ہیں جن میں اکثریت خواتین، ریٹائرڈ ملازمین اور چھوٹے چھوٹے سرمایہ کاروں کی ہے۔ جو کوئی کام نہیں کر سکتے۔ اب وہ اپنی اصل رقموں کو رو رہے ہیں۔ بھلا ایک روپے کا شیئر کس کے کام آئے گا۔

چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔ سب سے زیادہ خسارہ ہی مضاربہ اور انوسٹمنٹ کمپنیوں میں ہے، 62 کمپنیوں میں سے 56 کمپنیوں کے شیئرز کی قیمت 25 پیسے سے 2 روپے پچاس پیسے تک ہو چکی ہے، یہی حال انوسٹمنٹ کمپنیوں کے شیئرز کا ہے، 47 کمپنیوں میں سے 31 کمپنیاں خسارے میں چل رہی ہیں۔ ان کے شیئرز بھی ڈیڑھ روپے سے لے کر 4 روپے کے درمیان آ چکے ہیں۔ ٹیکسٹائل کے 82 کارخانوں میں سے 45 کارخانے خسارے میں چل رہے ہیں۔ ان کے شیئرز بھی دو روپے سے ساڑھے پانچ روپے تک آ چکے ہیں۔ لیزنگ کمپنیوں کی تعداد 41 ہے۔ جس میں 33 کمپنیاں خسارے میں چل رہی ہیں ان میں اکثریت کے شیئر ایک روپے بیس پیسے سے لے کر چار روپوں کے درمیان ہیں۔ خود حکومت کے میوچوئل فنڈ نمبر ایک سے لے کر نمبر 25 تک والے شیئرز کی قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے سے لے کر پانچ روپے تک ہو چکی ہے اور اسی پرائیویٹ سیکٹر میں شیئر 90 پیسے تک ہو چکا ہے۔

سیمنٹ کے کارخانے دن رات مہنگی سیمنٹ فروخت کر کر کے اندرونی طور پر اربوں روپے کما رہے ہیں۔ مگر 13 کارخانوں میں سے 9 کارخانے خسارہ دکھا رہے ہیں اور ایک بہت مشہور برانڈ، جس کا سیمنٹ اکثر کم

دستیاب ہوتا ہے۔ اس کا شیئر صرف چار روپے میں میں فروخت ہو رہا ہے۔ یاد رہے اس ادارے کے اور بھی دیگر شعبوں میں کارخانے لگے ہوئے ہیں۔ جو تمام کے تمام اپنی اصلی قیمت سے 50 سے 60 فیصد کم داموں پر فروخت ہو رہے ہیں۔

دوا سازی کی صنعتیں چونکہ تمام غیر ملکی ہیں۔ وہ 28 کی 28 منافع بخش ہیں۔ البتہ 6 کمپنیوں کے شیئر معمولی کمی دکھا رہے ہیں۔ 30 مختلف ٹائپ کی کمپنیوں میں صرف ایک وولن کے کارخانے پانچوں کے پانچ منافع پر چل رہے ہیں باقی 29 ٹائپ کے مختلف کارخانے میں 55 فیصد نقصان میں چل رہے ہیں۔ اور بہت سے کارخانے تو بند ہو چکے ہیں۔ 72 کارخانوں اور اداروں کے شیئر ایک روپے کے لگ بھگ ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کارخانے نہ صرف بند ہو چکے ہیں بلکہ دیوالیہ ہو چکے ہیں حکومت کا کوئی ادارہ ان سے پوچھ گچھ نہیں کرتا۔ جبکہ ان کے مالکان خود ارب پتی بنے شہر میں موجود ہیں اور دیگر جگہ سرمایہ کاری کر رہے ہیں، ان کی دولت فکسڈ ڈیپازٹ کی شکل میں بینکوں میں موجود ہے۔ جبکہ غریب سرمایہ کار غربت کی زندگی بسر کر رہا ہے فاقوں مر رہا ہے اور اکثر تو اپنی حسرتیں دل ہی میں لئے اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ دس بارہ سال پہلے نام نہاد انوسٹمنٹ کمپنیاں عوام کے اربوں روپے کھا کر فرار ہو گئی تھیں۔ آج تک ان بیچارے لٹے پٹے خاندانوں کا جن کی پوری زندگی کی پونجی لٹ گئی نہ تو حکومت نے کوئی مداوا کیا اور نہ ہی ان کی جائیدادوں کو بیچ کر ان متاثرہ لوگوں کو رقم لوٹائی گئی۔ نواز شریف صاحب لاکھوں گھر تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ میری ان سے درخواست ہے کہ خدارا! وہ کھربوں روپے میں سے ان متاثرین کو جن کی کل رقم 4 ارب روپے بنتی ہے۔ قومی خزانے سے ادا کر کے ان کی دعائیں لے لیں۔ حکومتیں آتی اور جاتی رہتی ہیں۔ یہ بیچارے اپنی جمع پونجی واپس ملنے کی حسرت لئے قبر میں جانے کا انتظار کر رہے ہیں اسی طرح ان سیٹھوں سے جن کے کارخانوں اور اداروں میں عوام نے سرمایہ کاری کی تھی ان کو گرفتار کر کے ان سے روپیہ لے کر سرمایہ کاروں کو ادا کر کے عوام کا اعتماد بڑھایا جائے تا کہ دیگر لوگ بھی آئندہ نئی صنعتوں میں سرمایہ کاری کر سکیں ورنہ ہماری معیشت بیمار صنعتوں کی وجہ سے دن بدن زوال پذیر رہے گی اور ہم آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور دیگر اداروں کے ہمیشہ مقروض رہیں گے۔ آخر میں پھر کہوں گا کہ ایک سرمایہ کاری کا ایسا نظام اور قانون بنایا جائے جس میں سرمایہ کار کے پیسے کا تحفظ ہو اور اس کو خورد برد کرنے والوں کا فوری محاسبہ ہو جیسا کہ بینکرز ایکویٹی اگرچہ بہت دیر سے شروع کیا ہے مگر اس کو تکمیل تک پہنچا کر ان غاصبوں سے روپیہ واپس لے کر عبرت ناک سزائیں دی جائیں تا کہ آئندہ کسی کو عوام کے سرمایے کو ہضم کرنے کی جرات نہ ہو۔

بھائی یہ ہرگز ہڑتال نہیں تھی

یکم ستمبر کو تھانے سے چند سپاہی ہمارے دفتر آئے اور مالکان کے نام اور گھروں کے پتے پوچھنے لگے۔ دفتر کے انچارج نے وجہ پوچھی تو کہا اگر آپ لوگوں نے 4 ستمبر کو دفتر نہیں کھولا تو مالکوں کو گرفتار کر کے بغاوت کا مقدمہ چلایا جائے گا۔ ان سے کہا گیا اگر ٹرانسپورٹ نہیں چلی تو ورکر کیسے آئیں گے۔ اگر ورکر نہیں آئے تو دفتر کون کھولے گا؟ انہوں نے کہا کہ ہم نہیں جانتے اوپر سے یہی آرڈر ہیں جب اوپر والوں سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے بھی معذرت کی اور کہا کہ ہم کو وزیراعلیٰ کا حکم ہے کہ ہڑتال ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ اگر ہڑتال ہوئی تو تمہاری خیر نہیں ہم نے ''بغاوت'' سے بچنے کے لیے آرڈر جاری کر دیا کہ فیکٹری اور دفتر دونوں کھلیں گے تقریباً پچیس سال پہلے ہمارا اور یونین کا معاہدہ ہوا تھا کہ ہفتے کے روز ہاف ڈے کے بجائے ایک ہفتے چھٹی ہوگی اور ایک ہفتے کام۔ تو اتفاق سے 4 ستمبر کا ہفتہ کام کرنے کا تھا۔ ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ 25 سال پرانا معاہدہ بھی آڑے نہیں آیا۔ اور ہم بغاوت کرنے سے بچ جائیں گے اور وزیراعلیٰ و پولیس حکام کے سامنے سرخرو ہی رہیں گے۔

4 ستمبر کی صبح دفتر اور فیکٹری کھول دی گئی 10 بجے دفتر فون کیا تو معلوم ہوا کہ ماشاء اللہ ورکر اور تین آفیسر کسی نہ کسی طرح دفتر آ گئے ہیں فیکٹری فون کیا تو چوکیدار نے بتایا کہ کوئی بس نہیں آئی۔ البتہ 4 ورکرز آ چکے ہیں افسروں کا انتظار ہے ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم بغاوت کے مقدمے سے بچ گئے یہ خوشخبری ہم نے تمام گھر والوں کو سنائی تب انہوں نے ناشتہ کیا۔ مگر ہماری خوشی عارضی ثابت ہوئی جب ان 9 افراد نے واپس جانے پر اصرار کیا۔ کیونکہ ان کے گھروں سے بار بار فون آ رہے تھے کہ آپ لوگ واپس آ جائیں شہر میں مکمل ہڑتال ہے مگر ہمارا اصرار تھا کہ شہر میں اگر ہڑتال ہوئی تو ہمارا دفتر اور فیکٹری کیسے کھلی ہوئی۔ میں نے مزید معلومات کے لیے اپنے ایک دوست کو جس کی دکان شہر میں تھی، فون کیا تو پہلی ہی گھنٹی پر اس کے چوکیدار نے فون اٹھا لیا میں

نے پوچھا، خان صاحب ہمارے دوست کو فون دو۔ اس نے کہا کہ صاحب باتھ روم میں ہیں۔ ہم نے فون بند کر دیا کہ ہمارے ورکرز غلط کہتے ہیں کہ شہر میں ہڑتال ہے ایک گھنٹے کے بعد پھر فون کیا تو چوکیدار نے پھر کہا کہ صاحب باتھ روم میں ہیں۔ ہم نے اس کو ڈانٹا کہ ایک گھنٹے پہلے بھی تم نے یہی کہا تھا اور اب بھی یہی کہہ رہے ہو تم کو نہیں معلوم کہ میں صاحب کا دوست ہوں، تب جا کر اس نے کہا کہ صاحب: ساری مارکیٹ بند ہے کل پولیس والے آئے تھے صاحب سے جانے کیا کہہ گئے۔ انہوں نے مجھے دوکان کھولنے کا حکم دیا اور کہا جو فون آئے بولو کہ صاحب باتھ روم میں ہیں۔ اور جب آذان ہو جائے تو بولنا کہ صاحب نماز پڑھنے گئے ہیں۔ دو گھنٹے بعد میں فون کر کے پوچھ لوں گا کہ کس کس کا فون آیا ہے۔ تو ان کو میں فون کر کے بتا دوں گا کہ میں دکان پر ہوں۔ کیا کروں، میری بیوی بچے مجھے دوکان نہیں جانے دے رہیں ہیں۔ ہم نے مزید آزمانے کے لیے ڈرائیور کو بازار سے پان لانے بھیجا۔ کیونکہ بہادر آباد کبھی بند نہیں ہوتا۔ تین گھنٹے کے بعد ڈرائیور ہانپتا کانپتا پان لے کر آیا کہ صاحب سارا شہر چھان مارا لانڈھی میں اس کا ایک جاننے والا پان فروش رہتا تھا اس کی دکان بھی اس محلے میں تھی اس کو اٹھایا اپنی دوستی کا واسطہ دیا تب جا کر اس نے دکان کا ایک پٹ کھولا اور پانچ پان بنا کر واپس اپنے گھر چلا گیا ہم نے سوچا کہ چلو ہم خود شہر کا معائنہ کرتے ہیں اور اسٹیل مل کے ساتھ ایک گالف کلب ہے۔ اس میں جا کر کھانا کھاتے ہیں اس طرح شہر کا معائنہ بھی ہو جائے گا اور کھانا بھی باہر کھا لیں گے۔ جب ہم ان گنجان آبادی والے علاقوں سے گزرے تو ڈرائیور کی بات سچ ثابت ہوئی نظر آئی۔ خاص طور پر جب محمد علی سوسائٹی سے گزرے تو وہاں ایک دکان جو کبھی عید اور بقرعید پر بھی بند نہیں ہوتی، وہ بھی بند تھی تو ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ یا اللہ آج کراچی والوں کو کیا ہو گیا کہ سب کے سب باغی ہو گئے۔ سرکار جب کل ان پر بغاوت کا مقدمہ چلائے گی تو کیا ہوگا الغرض تمام شاہرائیں سنسان تھیں۔ کل جن ٹرانسپورٹروں نے ہڑتال سے لاتعلقی کا اعلان چھپوایا تھا اور گورنر صاحب، وزیراعلیٰ صاحبان اور انتظامیہ کو یقین دلایا تھا ان پر ہم کو بڑا غصہ آیا کہ وہ ہمارے سیاست دانوں کی طرح جھوٹے وعدوں پر سب کو خوش کرنے پر اتر آئے ہیں۔ ہم صرف دس منٹ میں کلب پہنچ گئے جبکہ یہ راستہ چالیس منٹ میں طے ہوتا تھا اور ہڑتال یا چھٹی والے دن اس کلب میں جگہ نہیں ہوتی تھی۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں صرف ایک گاڑی کھڑی تھی۔ اندر گئے تو صرف فاسٹ فوڈ تھا کیونکہ اس کلب کے باہر سے آنے والے ورکرز نہیں آئے تھے لہذا کھانا کون پکاتا۔ جو ملا وہ کھا کر واپس روانہ ہوئے۔ سوچا رات کا کھانا باہر کھائیں گے کیونکہ ہمیشہ ہڑتال والے دن رات کو کھانے پینے کی تمام دکانیں اور ریسٹورنٹ کھل جاتے ہیں مگر یہ کیا کہ رات ہو گئی کلفٹن، سوسائٹی، کلشن کے ریسٹورنٹ آج رات کیوں نہیں کھلے

!بھوکے واپس گھر لوٹے تو ٹی وی آن کیا خبریں آرہی تھیں۔ٹی وی بتا رہا تھا کہ عوام نے ہڑتال کی کوشش ناکام بنادی اور تمام کراچی اور دیگر شہروں میں معمول کے مطابق کام ہوا۔دکانداروں نے اپوزیشن کو مسترد کر کے وزیراعظم پر بھرپور اعتماد کا مظاہرہ کیا مگر ہمارے بچوں کا اصرار تھا کہ ہم نے تو خود اپنی آنکھوں سے تمام بازار بند دیکھے ہیں۔یہ ٹی وی کے افسران کیوں غلط کہہ رہے ہیں میں نے کہا کہ بھئی یہ ٹی وی والے پورے ملک میں گھوم کر دیکھ آئے ہیں۔ان کی خبر بھی بھلا غلط ہوسکتی ہے!اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک گاؤں میں ایک بچہ بے ہوش ہوگیا ڈاکٹر کو بلایا گیا ڈاکٹر نے بچے کو آلے وغیرہ سے چیک کر کے بتایا کہ بچہ مرگیا ہے۔اس کے دیہاتی ماں باپ نہلا کر کمرے میں لائے تو بچہ اٹھ بیٹھا۔اس نے پوچھا کہ لوگ کیوں رو رہے ہیں اس کو بتلایا کہ وہ مرچکا ہے اس نے کہا کہ ابا ابا میں تو زندہ ہوں۔باپ نے ڈانٹا چپ چاپ لیٹ جا تو مرچکا ہے اس نے اصرار کیا کہ میں زندہ ہوں۔تو باپ نے کہا ڈاکٹر نے آلے سے چیک کر کے بتایا ہے کہ تو مرچکا ہے تو کیا ڈاکٹر سے زیادہ قابل ہے اسی لیے میں نے بچوں کو کہا کہ ٹی وی جو کہتا ہے' وہ سچ کہتا ہے کیا تم سارے ملک میں گھوم کر آئے ہو۔

مگر صبح کے اخبارات پڑھے تو معلوم ہوا کہ واقعی سارا شہر نہیں' پورے کے پورے ملک میں ہڑتال کامیاب رہی۔خود ہمارے ہردل عزیز گورنر صاحب کے صاحبزادے بھی اپنی دکان نہیں کھول سکے۔چونکہ وہ مارکیٹ کے فیصلے کے پابند تھے اور جس کا اعتراف گورنر صاحب نے بھی کیا۔مگر حکام کا دعوی تھا کہ عوام نے ہڑتال کو مسترد کر دیا۔تمام وزراء کے بیانات بھی یہی تھے کہ تمام بازار کھلے رہے اور قوم نے وزیراعظم کے مینڈیٹ کا بھرم برقرار رکھا۔وزیراعلی پنجاب نے تو عوام کو دکانیں کھلی رکھنے پر مبارکباد بھی دی البتہ یہ بھی کہا کہ چند دکانیں بند ہونے سے ہڑتال نہیں ہوتی اس پر مجھے ایک اور واقعہ یاد آیا کہ لکھنو کے ایک نواب صاحب سخت سردی میں ململ کا کرتا پہنے بازار جارہے تھے ان کی ملاقات ایک دوست سے ہوئی اس نے پوچھا 'نواب صاحب کیا آپ کی سردی نہیں لگ رہی' نواب صاحب بولے' حضرت سردی بالکل نہیں لگ رہی مگر یہ کم بخت کپکپی تنگ کر رہی ہے تو بھائی یہ ہڑتال نہیں تھی کیونکہ چند دکانیں تو کھلی تھیں نا!

اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ ہڑتال کرانے میں سب سے زیادہ ہاتھ خود حکومت کا اور اس کے کارندوں کا تھا۔جنھوں نے دو ہفتے پہلے سے دھمکیوں اور بیانات سے فضاء کو خوفناک بنادیا اور اس میں شاہ سے بڑھ کر شاہ کے وفاداروں سے کا کردار ادا کیا خاموشی سے ہڑتال ہوجاتی تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑتی اور وہ ایسی کامیاب بھی نہ ہوتی جیسی حکومت اور اپوزیشن کے درمیان دھمکیوں کے تبادلے کے نتیجے میں ہوئی اخبارات ہڑتال کے حق

میں اور ہڑتال کے خلاف زور وشور سے محاذ آرائی جاری تھی جتنے بیانات تاجر تنظیموں کی طرف سے نہیں آئے جنہوں نے اصل میں ہڑتال کی اپیل کی تھی۔اس سے زیادہ حکومت کی مشینری پولیس انتظامیہ گھر گھر دکان دکان مارکیٹوں اور ٹرانسپورٹرز کو اپنے وسائل استعمال کر کے مجبور کر رہی تھی کہ اگر کسی نے دکان بند کی تو اس سے سختی سے نمٹا جائیگا۔حالانکہ ہڑتال کی اپیل تاجر نمائندوں کی طرف سے تھی۔اس سے فائدہ اٹھایا اپوزیشن نے کیونکہ ہر شخص جی ایس ٹی (GST) کے خلاف تھا۔بھلا چھوٹے چھوٹے دوکاندار کیسے یہ حساب کتاب رکھتے۔جو بڑے دوکاندار ہیں ان کو حساب کتاب رکھنے کی فرصت نہیں اور جو چھوٹے دکاندار ہیں ان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ وہ حساب کتاب رکھیں رہے باقی مارکیٹیں اور ٹرانسپورٹرز تو وہ بسوں اور دکانوں کے جلنے سے بچنے کے لیے بسیں شاہراہوں پر نہیں لاتے جب ٹرانسپورٹ بند ہوگی تو ورکرز کیسے کام پر آئیں گے جب ورکرز کام پر نہیں آئیں گے تو فیکڑیاں اور دکانیں' دفاتر کیسے کھلیں گے۔پھر جب خریدار خوف سے گھر سے نہیں نکلے گا تو دکان کھولنے سے کیا فائدہ؟ میں نے پچھلے کالم میں بھی یہ نشاندہی کی تھی کہ اس وقت پورا ملک مندی کا شکار ہے کاروبار گھٹ رہے ہیں۔فیکڑیاں بند ہو رہی ہیں مہنگائی حد سے بڑھ کر عوام کی دسترس سے باہر ہوچکی ہے پہلے کبھی کبھی منی بجٹ آتے تھے اب ڈیلی بجٹ آرہے ہیں حکام اپنے اخراجات کم کرنے کے بجائے ٹیکسوں پر ٹیکس لگا رہے ہیں اس کا ردعمل لازمی ہے جو اس ہڑتال کی شکل میں ابھرا ہے اگر مناسب اقدامات اور عوام کو ریلیف نہیں دیا گیا تو ایوب خان کے زمانے میں چینی کے نرخ بڑھنے سے جو ردعمل ہوا تھا وہ دہرائے جانے کا بھرپور خطرہ ہے لہٰذا مہنگائی ختم تو نہیں کی جاسکتی مگر کم کی جاسکتی ہے اور گیس بجلی پیٹرول جن پر حکومت کی اجارہ داری ہے کے نرخ کم کر کے ٹیکسوں کا بوجھ ہلکا کر کے عوام کو ریلیف دیا جاسکتا ہے اربوں روپے خرچ کر کے نئے گھروں کی خوشخبری سنانے کے بجائے بنیادی چیزوں کے دام گھٹا دینا زیادہ عقلمندی ہے جبکہ یہ خود حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کا فارمولا اب ناکام ہورہا ہے جب تک ہم بجٹ کا بیشتر حصہ پیداواری یونٹ پر نہیں لگائیں گے عوام مہنگائی کے بوجھ تلے دبتے جائیں گے اور جب حالات پلٹا کھائیں گے تو یہی مینڈیٹ حکومت پر پتھر بن کر برسے گا۔

میچ فکسنگ کا ڈراپ سین

آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہوگیا۔ یہ ڈراپ سین وسیم اکرم کو میچ فکسنگ کے الزامات سے بری کر کے انہیں دوبارہ کپتان بنانے پر ہوا۔ قوم ایک مرتبہ پھر سکتے میں آ گئی کہ یہ کیسا احتساب ہے کہ سلیم ملک اور اعجاز احمد (جن پر معاونت کا الزام تھا) کے سروں پر ابھی تک احتساب کی تلوار لٹکی ہوئی ہے اور اصلی سینیئر کو کلیئر کر کے ٹورنٹو روانہ کر دیا گیا ہے۔ یہ فیصلہ فرد واحد کا فیصلہ ہے جس سے فکسنگ کے الزامت ختم ہونے کے بجائے شکوک وشبہات میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔

ورلڈکپ کے فائنل میں پاکستان کی افسوسناک شکست کے بعد عوام کے مطالبے پر پاکستان کرکٹ کنٹرول بورڈ کو توڑ کر ایڈہاک چیئرمین مجیب الرحمان کو بنایا گیا جنہوں نے آتے ہی وسیم اکرم، سلیم ملک اور اعجاز احمد کو میچ فکسنگ کے الزام میں معطل کر دیا اور الزامات کی آزادانہ، منصفانہ تحقیقات کا یقین دلایا۔ تمام شہروں کی کرکٹ ایسوسی ایشنوں کو بھی ختم کر کے وہاں ایڈہاک کمیٹیاں بنا دی گئیں۔ کراچی کرکٹ ایسوسی ایشن پر خاص مہربانی ہوئی۔ تمام اکاؤنٹ منجمد کر دیئے گئے اور آج کل عدالتی کارروائیاں جاری ہیں۔

اس سے قبل بھی ہمارے سینیئر کھلاڑیوں پر میچ فکسنگ کے الزامات لگتے رہے ہیں اور اس سلسلے میں جسٹس ملک قیوم بھی کافی عرصے سے انکوائری کر رہے ہیں جس میں عطاء الرحمان، عامر سہیل، راشد لطیف نے ان سینیئر کھلاڑیوں کے خلاف شہادتیں قلمبند کرائی ہیں، بعد میں عطاء الرحمان نامعلوم وجوہات کی بناء پر اپنے پچھلے بیانات سے پھر گئے اور اپنی ہی گواہی کی تردید کر دی، جس پر عدالت نے ان کا پاسپورٹ ضبط اور باہر جانے پر پابندی عائد کر دی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ تحقیقاتی ٹریبونل ان سینیئر کھلاڑیوں پر الزامات ثابت کر کے کوئی سزا تجویز کر دیتا تو کیا اس طرح یہ توہین عدالت نہیں ہوتی۔ آج تک احتساب بیورو نے یہ نہیں بتایا کہ کس کس نے ان کی تحقیقات میں حصہ لیا۔ کس کس کی گواہی حاصل کی گئی۔ بنگلہ دیش سے پاکستان کیسے ہارا۔

بھارت سے کیسے ہارا۔ ہارنے والے کپتان اور ان کے کھلاڑی ندامت کے بجائے بڑے ہشاش بشاش تبصرے کر رہے تھے۔ ان کا کہنا صرف یہ تھا کہ اس ہارنے سے پاکستان کے فائنل کھیلنے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا وغیرہ وغیرہ اور جبکہ لندن میں پریس کانفرنس کے دوران بورڈ کے چیئرمین مجیب الرحمان صاحب نے بتایا کہ وسیم اکرم، اعجاز اور سلیم ملک نے معافی طلب کی ہے لہٰذا وسیم اکرم کو معاف کر دیا گیا ہے کیونکہ انہوں نے کرکٹ کے میدان میں پاکستان کا نام خوب روشن کیا ہے اور اگلے چار پانچ سال میں وہ کئی نئے ریکارڈ بنائیں گے۔ خصوصاً بھارتی کھلاڑی کپیل دیو کا سب سے زیادہ وکٹیں لینے کا ریکارڈ توڑنا چاہتے ہیں اور اچھے کپتان ہیں اور آل راؤنڈر ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اس میں تو کوئی کلام نہیں ہے کہ وسیم اکرم دنیا کے بہترین ال راؤنڈر ہیں بہترین بالر ہیں۔ تاہم اگر وہ پوری ٹیم کو جوئے جیسی لعنت میں مبتلا کر دیں اور ہماری ٹیم معمولی معمولی ٹیموں سے ہارنے کا ریکارڈ قائم کرے تو پاکستان کے عوام پر کیا گزرے گی۔ جیسا کہ ورلڈکپ میں دیکھنے میں آیا۔ ساتھ ساتھ چیئرمین صاحب کا یہ کہنا کہ میں نے فیصلے میں اپنے تمام سلیکٹر صاحبان سے بھی مشورہ کر لیا ہے تو جناب یہ سلیکٹرز بھی تو آپ نے ہی ''سلیکیٹ'' کئے ہیں، وہ آپ سے کیسے اختلاف کریں گے۔ انہیں بھی تو نوکری کرنی ہے پھر جس ٹیم میں عامر سہیل، وقار یونس اور راشد لطیف ہوں گے جنہوں نے وسیم اکرم کے خلاف بیان دیا تھا اور وسیم اکرم کپتان ہوں تو آپس میں کیسے ٹیم ورک ہوگا۔ بہرحال قوم اگرچہ وسیم اکرم کی خدمات کو سراہتی ہے مگر اس فیصلے پر مطمئن نہیں ہے خصوصاً دوبارہ کپتان بنانے کے حق میں ہرگز نہیں ہے چاہے وہ تمام میچ جتا دیں۔ کیونکہ ملک کا مفاد جس کو عزیز نہ ہو اور جو قوم کے جذبات سے کھیلے، وہ کم از کم کپتان منظور نہیں۔ آج ٹورنٹو میں پاکستان کا مقابلہ ویسٹ انڈیز سے ہوا اگرچہ پاکستان نے یہ میچ جیت لیا مگر پاکستانی ٹیم میں ہم آہنگی کا فقدان تھا۔ خاص طور پر جب وقار نے اپنے دوسرے اوور میں پہلی گیند پر پہلی وکٹ لی تو دوسری ہی گیند پر وسیم اکرم نے انتہائی آسان کیچ چھوڑ دیا۔ یہ کیچ سلوموشن (Slow Motion) میں دوبارہ دکھایا گیا تو حیرت ہوئی اور ایسا لگتا تھا کہ جیسے کیچ پکڑ کر جان بوجھ کر چھوڑ دیا ہو اور پھر تیسری گیند پر عبدالرزاق نے بھی ایک آسان کیچ چھوڑ دیا اس موقع پر وقار نے نفرت کے ساتھ عبدالرزاق اور وسیم اکرم کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ تم نہیں چاہتے کہ میں ٹیم میں مستقل آسکوں۔ پاکستانی ٹیم نے بہت ہی آسان کیچ چھوڑے خود وقار یونس نے بھی آسان کیچ چھوڑا اور کوئی بھی بالر ایک سے زیادہ وکٹ نہیں لے سکا۔ اسی طرح بیٹنگ میں بھی بہت اچھا اسٹارٹ یعنی 130 رنز کا ملا پھر کھلاڑی جلد جلد آؤٹ ہوتے گئے۔ پانچویں پوزیشن میں وسیم اکرم کو خود بیٹنگ کے لئے آنا چاہئے تھا کیونکہ دس اوور کا

کھیل باقی تھا اور اسکور کوئی خاص نہیں تھا اس وقت دھواں دھار بیٹنگ کی ضرورت تھی مگر آخری اوور تک وسیم اکرم کھیلنے نہیں آئے صرف اظہر محمود نے آخری اوور میں 20 رنز بنا کر 230 رنز کر دیا حالانکہ لگتا یہی تھا کہ پاکستان 260 رنز تک کا ٹارگٹ دے گا۔ خود عامر سہیل نے 20 گیندیں ضائع کیں اور صرف 8 رنز بنا سکے کیونکہ وہ بھی آؤٹ آف پریکٹس تھے۔ جن کو اچانک ٹورنٹو بھیج دیا گیا خود وسیم اکرم کی بالنگ پھیکی پھیکی تھی اس میں وہ ردھم دیکھنے میں نہیں آیا جو وسیم اکرم کا خاصا ہے۔ الغرض پاکستان کے میچ جیتنے کے باوجود کوئی سنسنی خیزی دیکھنے میں نہیں آئی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کب تک جسٹس قیوم کا فیصلہ آتا ہے یہ میچ فکسنگ کا بحران کب ختم ہوتا ہے۔ وہ ختم ہو یا نہ ہو ہماری ٹیم اب گروپنگ کا شکار ہوگی وسیم کی کوشش ہوگی کہ عامر سہیل اور وقار یونس کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکیں اور ٹیم میں مستقل جگہ نہ بن سکے۔ کچھ کھلاڑی ان کا ساتھ دیں گے اور کچھ مخالف گروپ کا۔ لہٰذا بورڈ کو چاہئے کہ اس پر کڑی نگاہ رکھے۔ پاکستان کی پہلے ہی بہت بدنامی ہو چکی ہے اور کھلاڑی بھی ذہنی دباؤ کا شکار رہے ہیں لہٰذا بورڈ اور ٹیم کو چاہئے کہ سب کچھ بھلا کر صرف کرکٹ کھیلنے لگ جائیں اور اگلے ورلڈ کپ کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں اسی میں ان کی بہتری ہے۔

ہے کوئی ہے کوئی

4 ستمبر کی ملک گیر ہڑتال کے بعد سیاسی صورتحال کافی بدل رہی ہے۔ دراصل ہڑتال کی کال جنرل سیلز ٹیکس کے نفاذ کے خلاف چھوٹے تاجروں کی انجمنوں' ایسوسی ایشن سب نے مل کر دی تھی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے تاجر دو کاندار زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہوتے لہٰذا وہ ان رجسٹروں کے چکر میں نہیں پڑ سکتے چونکہ جی ایس ٹی سیکٹر یباً سب ہی متاثر تھے لہٰذا ایک دن کی ہڑتال کی کال پر پورے ملک میں کامیاب ترین پہیہ جام ہڑتال ہوئی اس موقع سے اپوزیشن نے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا۔ تمام پارٹیوں نے ہڑتال کی حمایت کی اور اس کا کریڈٹ بھی لیا۔

ہڑتال کے بعد حکومت نے آناً فاناً تاجروں کے نمائندوں کو بلا کر ان کا جی ایس ٹی والا مطالبہ مان لیا اور بغیر حساب کتاب رکھے 0.75% ٹیکس ایمانداری سے خود ہی جمع کرا دینے کا نسخہ ایجاد کیا۔ اس کے نتیجے میں وقتی طور پر یہ بحران ٹل گیا مگر جاتے جاتے حکومت کے مینڈیٹ کو ہلا گیا۔

اس وقت ملک افواہوں قیاس آرائیوں، تردیدوں، دعووں کے گرداب میں ہے کبھی میاں اظہر سے اختلافات سے اخباروں کی زینت بنتے ہیں اور کبھی چیف آف آرمی اسٹاف جنرل پرویز مشرف سے اختلافات اور کبھی ان کے استعفے دے دینے کے حوالے سے بحث گرم ہوتی ہے۔ پھر اچانک یہ تاثر ملتا ہے کہ کارگل کے معاملے میں فوج اور وزیراعظم میں اختلافات پائے جاتے ہیں تاہم حکومت کی جانب سے اس کی تردید پر تردید ہوتی ہے پھر اچانک وزیراعلیٰ پنجاب جناب شہباز شریف کے دورۂ امریکہ پر لے دے شروع ہو جاتی ہے اپوزیشن کا کہنا ہے کہ ملک کے دیگر صوبوں کے وزراء اعلیٰ پر وزیراعظم کو کیوں اتنا اعتماد نہیں ہے؟ وہ اس طرح کھل کر اپنے صوبے کے لیے مرکزی حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی معاہدہ کیوں نہیں کر سکتے؟

دوسری طرف اپوزیشن نے متحد ہو کر گرینڈ الائنس بنا لیا ہے صرف جماعت اسلامی اور جے یو پی (نورانی

گروپ) اس میں شامل نہیں ہے جماعت اسلامی نے اس دفعہ اپنی طاقت اپنی حکومت کا نعرہ لگا کر اپنے جلسے جلوس ملک بھر میں نکالنے شروع کر دیے ہیں۔ جس میں عوام کی تعداد خاصی ہوتی ہے۔ جناب شاہ احمد نورانی نے سندھ کابینہ میں شاہ فرید الحق کو شامل کرا کے حکومت کا ساتھ دینے کا عندیہ دیا ہے۔ اس گرینڈ الائنس کا پہلے صرف ایک نعرہ تھا کہ نواز شریف کو اقتدار سے ہٹایا جائے پھر کیا کیا جائے یہ ابھی تک عوام کے سامنے نہیں آیا۔ تقریباً ہر پارٹی کا سربراہ صدر اور وزیر اعظم سے کم کی سوچ نہیں رکھتا۔ صدارت کے امیدواروں میں نواب زادہ نصر اللہ خان سابق چیف جسٹس سجاد علی شاہ اور فاروق لغاری سرفہرست ہیں۔ جبکہ وزیر اعظم کے لئے اپوزیشن کی طرف سے محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ' عمران خان' طاہر القادری اور مصطفیٰ کھر کے حق میں جلسوں میں نعرے لگ چکے ہیں جبکہ باہر سے آنے والے کروپوں کا خیال ہے کہ میاں اظہر' آفتاب شیر پاؤ' مخدوم امین فہیم کو بھی اسٹینڈ بائی میں رکھا گیا ہے۔ کچھ حلقوں کا خیال ہے کہ ٹیکنو کرپٹ ایماندار' ریٹائرڈ' بیوروکریٹ سابقہ ججز لوں اور ججوں پر مشتمل غیر جانبدار (Neutral) حکومت بنائی جائے جو دونوں سابقہ حکومت کا آزادانہ و منصفانہ احتساب کر کے عوام کا لوٹا ہوا سرمایہ وصول کرے اور عبرت ناک سزائیں دلوا کر پھر نئے سرے سے انتخابات کروائے تاکہ کند کی صاف ہو۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ کون کرے گا آئین تو اس کی اجازت نہیں دیتا! فوج اس میں ملوث نہیں ہونا چاہتی ہے اب صرف عدلیہ رہ جاتی ہے تو وہ اکیلے یہ کام نہیں کر سکتی۔ عوام پر سے حکومت اور حزب مخالف دونوں کا اعتماد ختم ہو چکا ہے کوئی متبادل قیادت بھی موجود نہیں ہے اسی وجہ سے گزشتہ الیکشن میں صرف ایک چوتھائی ووٹ ڈال کر عوام نے اپنی بیزاری کا ثبوت دے دیا تھا اور عوام کو اس سے بھی کوئی غرض نہیں ہے کہ کون حکومت کرنا چاہتا ہے اور کس کی حکومت ختم کی جائے اس کی صاف وجہ یہ ہے کہ عوام کے مسائل کا کسی نے بھی حل پیش نہیں کیا۔ کسی کے پاس کوئی پروگرام نہیں ہے مہنگائی کا ذمہ دار کون ہے اور وہ کیسے ختم کی جا سکے گا۔ بیروزگاری کو کیسے روکا جائے گا۔ پانی' بجلی' گیس جیسی ضروری سہولتیں میسر نہیں ہیں اندرونی سڑکیں ٹوٹی پھوٹی ہیں۔ سیوریج کا نظام پورے ملک میں مفلوج ہے۔ تعلیمی میدان میں ہم نے آج تک کوئی انقلابی اقدامات نہیں کئے۔ خاص طور پر جدید ٹیکنالوجی میں ہم بھارت سے بہت پیچھے ہیں ہماری درس گاہیں بے راہ روی کا شکار ہیں۔ ہم اچھے اساتذہ سے محروم ہیں۔ جس کی وجہ سے نئی نسل بھی منشیات' کلاشنکوف کلچر کی طرف رواں دواں ہے۔ ملک کے مستقبل کی کسی کو فکر نہیں ہے۔ رہا قانون کا احترام تو پورے ملک میں لا اینڈ آرڈر کی پوزیشن تشویشناک ہے بڑے شہروں میں قتل' ڈاکے' گاڑیوں کا چھیننا روز کا معمول ہے۔ پولیس اور انتظامیہ بے بس ہے۔ سرکاری اہلکاروں پر کسی کو بھروسہ نہیں رہا ملک کی معیشت

دن بہ دن کمزور ہو رہی ہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک دونوں نے اپنی اپنی شرائط پر قرضوں کی ری شیڈولنگ کر کے بھی آگے قرضے کی حامی بھری ہے۔ اسٹاک ایکسچینج میں مندی کا رجحان ہے تمام کاروباروں پر جمود طاری ہے۔ لوگوں کے پاس آٹا' دال خریدنے کے بعد اگلے روز کھانے کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ غربت کی وجہ سے خودکشی اور خودسوزی کے واقعات کی خبریں روزانہ اخبارات میں چھپ رہی ہیں۔ حکومت کے پاس اپنے آپ کو بچانے کے لئے تو وقت ہے عوام کے مسائل حل کرنے کے لئے وقت نہیں ہے۔ صرف نجکاری کے نام پر اربوں روپے کی زمین اپنے اپنے آدمیوں کو کوڑیوں کے مول فروخت کر دی گئی۔ پی آئی اے میں گولڈن شیک ہینڈ کر کے ملازمین کو فارغ کر دیا گیا اور اب پسند کے لوگوں کی بھرتی جاری ہے۔ کراچی ایئرپورٹ کو جمبو جہازوں کا قبرستان بنا دیا گیا ہے۔ ایک درجن سے زیادہ ناکارہ جہاز برائے فروخت کھڑے ہیں مگر کوئی خریدار نہیں جبکہ 20 ہزار ڈالر یومیہ پر غیر ملکی جہاز کرائے پر لے کر چلائے جا رہے ہیں۔ اپنے جہازوں کو ناکارہ دکھا کر کوڑیوں کے بھاؤ بیچنے کی تیاری ہو چکی ہے۔ 75 فی صد کاٹن برآمد کر دی گئی اب ٹیکسٹائل ملوں کے لئے روئی کہاں سے آئے گی۔ کپڑا ایکسپورٹ کرنے کے بجائے ہم خام مال ایکسپورٹ کر کے بڑے خوش ہو رہے ہیں۔ غیر ضروری اشیاء اور سامان تعیش جن سے پاکستان کے بازار پٹے پڑے ہیں۔ قیمتی زرمبادلہ خرچ کر کے درآمد کرنے کو اپنے کلچر کا حصہ بنا لیا ہے۔ عوام خاموش تماشائی بنے امیدوں کے قبرستان میں آس لگائے بیٹھے ہیں۔ ان کی آنکھیں بہ زبان خاموشی سوال کر رہی ہیں کوئی ہے جو ہمیں مایوسیوں کے اندھیروں سے نکالے ؟ ہے کوئی؟۔۔۔ ہے کوئی۔۔۔؟

پاک چین دوستی زندہ باد

پاکستان میں گزشتہ ہفتے حکومت اور پی ٹی وی نے چین کا خصوصی ہفتہ منایا۔ یہ ان کے اکیاون سالہ جشن آزادی کے موقع پر منایا گیا۔ اس ہفتہ پاک چین دوستی کا زبردست مظاہرہ کیا گیا اور چینی بھائیوں کے جشن آزادی میں پاکستانیوں نے بھی بھرپور شرکت کی۔ جس سے یقیناً پاک چین دوستی میں مزید پیش رفت ہوگی۔ چین ہمارا قریب ترین اور عظیم پڑوسی ہے جس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔ پاکستان پر جب بھی کوئی برا وقت پڑا چین نے بھرپور ساتھ دے کر اپنے مخلصانہ دوستی کا ثبوت دیا۔ جو ایک اچھے پڑوسی کی نشانی ہے۔ چین نے کئی مرتبہ پاکستان کو بیرونی خطرات سے قبل از وقت آگاہ بھی کیا اور ان سے نمٹنے کا نہ صرف حل بتایا بلکہ اکثر اوقات معاملات سے نمٹنے میں عملی مدد بھی کی۔ ایوب خان سے لے کر موجودہ حکومت تک سب نے بین الاقوامی تعلقات میں جس کی دوستی کو سب سے زیادہ اہمیت دی اور ماؤزے تنگ اور چواین لائی سے لے کر چین کے موجودہ حکمرانوں تک سب سے پاکستان کے ساتھ بہترین اور خصوصی تعلقات استوار رکھے اور ان میں اضافے کے لئے کوشاں ہے اور آج پاک چین دوستی' قوموں کے درمیان تعلقات کے حوالے سے جس مقام پر ہے' اس کی مثالیں دنیا میں کم ہی کم ملیں گی اور یہ عدیم المثال دوستی' دونوں کے دشمنوں کی نگاہ میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ آج سے 32 سال قبل 1967ء میں پہلی بار بیرون ملک جانے کا اتفاق ہوا تو وہ پہلا غیر ملکی سفر چین کا تھا۔ اس زمانے میں ہانگ کانگ کے لئے پی آئی اے کی پرواز چین کے شہر کینٹون (Canton) کے راستے جاتی تھی۔ جہاں ایک رات ٹھہرا کر دوسرے دن بذریعہ ٹرین ہانگ کانگ جانا پڑتا تھا۔ چنانچہ دوپہر میں کینٹون پہنچا بہت کھلا کھلا اور صاف ستھرا شہر تھا۔ اس زمانے میں کراچی اور کینٹون کی آبادی برابر تھی۔ یعنی تیس چالیس لاکھ مگر کینٹون میں صرف ایک ہوٹل تھا جس میں تقریباً 800 کمرے تھے۔ ہماری فلائٹ کے تقریباً 50 مسافر اس ہوٹل میں ٹھہرائے گئے تھے باقی تمام فلور خالی تھے۔ انکشاف ہوا

کہ غیر ملکی فضائی کمپنیوں میں صرف پی آئی اے کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ چین کی سرزمین کو استعمال کر سکتی ہے۔ باقی کسی بھی ایئر لائن کے چین آنے یا جانے پر پابندی تھی۔ کینٹون صنعتی شہر بھی تھا اور زرعی بھی۔ لہٰذا ایک طرف فیکٹریاں تھیں تو دوسری جانب سبزہ ہی سبزہ۔ ہم شام 5 بجے ہوٹل کے باہر کھڑے تھے کہ یکا یک سینکڑوں سائیکل سوار ہمارے ہوٹل کے آگے سے گزرے جن میں تقریباً ہر عمر کے لوگ شامل تھے۔ پی آئی اے کے عملے کے افراد نے ہمیں بتایا کہ نزدیکی فیکٹریوں کی چھٹی ہوئی ہے اور یہ تمام سائیکل سوار انہی فیکٹریوں کے ملازم تھے اور ہر روز صبح و شام اسی طرح آتے جاتے ہیں۔ ان سائیکل سواروں نے ہمیں دیکھ کر ہاتھ ہلائے اور ہم نے بھی ہاتھ ہلا کر ان کو جواب دیا۔ یہ پاکستان اور چین کے عوام کے درمیان دوستی کے جذبے کا ایک مخلصانہ اظہار تھا۔ چین کا ذکر ایک حدیث مبارک میں بھی آیا ہے کہ یعنی ''علم حاصل کرو' چاہے اس کے لئے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔'' حدیث مبارک میں چین کے اس ذکر کے دو پہلو ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اس زمانے میں چین ایک دور افتادہ ملک تھا اور جہاں پہنچنا ایک دشوار ترین کام تھا لہٰذا حدیث پاک میں چین کا ذکر اس حوالے سے کیا گیا کہ علم حاصل کرنے کے لیے کیسا ہی طویل اور دشوار سفر کرنا پڑے۔ اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس زمانے میں کبھی بھی چین علم و ہنر اور تہذیب و تمدن میں اس قدر آگے تھا کہ وہاں کا سفر علم کے جویا لوگوں کے لیے ضروری تھا علاج معالجے کے لیئے جڑی بوٹیوں۔ یوگا۔ ایکوپنکچر جیسی طبی سہولتیں وہاں اس وقت بھی میسر تھیں انکشاف کئی چین کا سفر کرنے والے کئی مسلمان اور غیر مسلم سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں کیا تھا۔ چین کے زمانہ قدیم سے علم و ہنر میں یکتائے روزگار ہونے کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے تو آج بھی اور دیوار چین کی صورت میں موجود ہے جو دنیا کے سات عجائب میں شمار ہوتی ہے۔ اس زمانے میں یعنی آج سے تیس سال پہلے الیکٹرک ٹرینیں شہروں میں آمد و رفت کا ذریعہ تھیں اور بڑی بڑی ٹرینیں ایک ایک شہر سے دوسرے شہر آتی جاتی تھیں چین چونکہ ایک کمیونسٹ ملک تھا اس لیئے تمام کاروبار، صنعتیں حکومت کی ملکیت تھیں اور عوام اس میں کام کر کے اپنی اور ملک کی ضروریات پوری کرتے تھے اس طرح گویا ہر شخص سرکاری ملازم تھا۔ کوئی چیز کسی کی ذاتی ملکیت نہیں تھی حکومت روٹی، کپڑا اور مکان فراہم کرنے کی ذمہ داری تھی۔ سرکاری طور پر چند ہی گاڑیاں دیکھنے میں آئیں معلوم ہوا کہ یہ غیر ملکی سفیروں اور سربراہوں کے آمد و رفت کے وقت استعمال ہوتی ہیں باقی تمام لوگ یا تو سائیکلوں پر سفر کرتے ہیں یا پھر الیکٹرک کی بسوں اور ٹرینوں کے ذریعے آتے جاتے ہیں۔

پھر چین میں صنعتی انقلاب آیا آہستہ آہستہ ڈی نیشنلائزیشن شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے چین میں بڑی

بڑی صنعتیں لگنے لگیں غیر ملکی بھی جن میں جاپان اور کوریا کے صنعتکار سرفہرست تھے چین کے شہروں میں صنعتیں لگانے لگے کیونکہ یہاں افرادی قوت وافر اور سستی تھی۔ چینی عوام بہت محنتی اور ذہین ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ دس پندرہ سال کے مختصر عرصے میں چین سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک ہر چیز بنانے کی ٹیکنالوجی حاصل کر لی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز اور بڑی سے بڑی چیز وہاں بنائی جا رہی ہے، جو نہ صرف چینی عوام استعمال کر رہے ہیں بلکہ بڑے پیمانے پر سستے داموں یہ اشیاء دنیا بھر میں ایکسپورٹ کر کے بھاری زرمبادلہ بھی کما رہے ہیں۔ معیاری اور کم قیمت ہونے کی وجہ سے چینی اشیاء کی یورپ اور امریکہ میں بہت مانگ ہے اس صنعتی انقلاب میں دنیا کی تمام بڑی بڑی فیکڑیاں جن میں ادویات چمڑا ٹیکسٹائل کیمیکل پلانٹ وغیرہ سرفہرست ہیں تمام کی تمام چین میں جوائنٹ وینچر کی شکل میں لگ چکی ہیں۔ ہانگ کانگ میں انکے نمائندہ دفاتر ہیں اور چین میں ان کی فیکڑیاں ہیں ۔ ہانگ کانگ بھی اپنی سو سالہ مدت پوری کر کے واپس چین کا حصہ بن چکا ہے ۔الغرض ہم کو چین سے سبق سیکھنا چاہیئے کہ انہوں نے اتنے کم وقت میں کیسے ترقی کی اور ہم کو غور کرنا چاہیے کہ صنعتی ترقی کرنے کے بجائے زوالپذیر کیوں ہیں؟

میرا خیال ہے کہ اگر ہماری حکومت چینی حکومت کے ساتھ بات چیت کرے تو چین اب اس پوزیشن میں ہے کہ وہ ہمارے ملک میں سرمایہ کاری کر کے دونوں ممالک کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کرے۔ چینی اور پاکستانی عوام میں کئی باتیں مشترک ہیں دونوں محنتی اور جفاکش ہیں دونوں ایثار وخلوص کے پیکر ہیں مگر ہم نچینیوں کی دوستی سے وہ فوائد حاصل نہیں کیے جو ہم کر سکتے تھے؛ ہمیں کرنا چاہیے تھے صنعتی معاملات ہوں یا دفاعی معاملات ہمیں چین سے زیادہ مخلص اور قابل اعتماد دوست نہیں ملے گا ایسا دوست جو وقت پڑنے پر پیچھے نہ ہٹے تیس سال بعد دوبارہ چین جانے کا اتفاق ہوا تو اسی کینٹون شہر میں جہاں صرف ایک ہوٹل تھا یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ گلی گلی فائیو اسٹار موجود ہیں۔ اور ترقی یافتہ ممالک کی طرح چین کے ہوائی اڈہ پر دنیا بھر کی تمام ائر لائنوں کے جہاز آ جا رہے ہیں۔ بلند وبالا طرز کی بلڈنگوں کی قطاریں ہیں جہاں چند گاڑیاں تھیں وہاں آج کشادہ اور صاف ستھری سڑکوں پر گاڑیوں کی قطاریں ہیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں سرکاری اور نجی دونوں شعبوں میں خوب سرمایہ کاری ہو رہی ہے نئی نئی صنعتیں لگ رہی ہیں مگر ہم کہاں کھڑے ہیں؟ اس عظیم پڑوسی کی مخلصانہ دوستی سے بھی کوئی فائدہ اٹھانے سے محروم ہیں۔ ہم آئی ایم ایف، ورلڈ بینک لندن کلب پیرس کلب سے امیدیں لگائے بیٹھے۔

جو یہودی سوچ کی اختراع ہے جو ایک ڈالر دے کر دس دس ڈالر وصول کر کے ہندو بنیوں کی یاد تازہ

کر رہے ہیں۔ ہماری صنعتی ترقی میں نت نئی رکاوٹیں ڈال کر ہمیں اپنا دست نگر رکھنا چاہتے ہیں۔ گذشتہ پندرہ سال سے کراچی میں چین کے جتنے بھی قونصل جنرل آئے پاکستان سے محبت ان کی قدر مشترک رہی ہے۔ مگر موجودہ قونصل جنرل کی بات جدا ہے موصوف) نہ صرف پاکستان بلکہ پاکستان کی ہر چیز سے محبت دل سے کرتے ہیں، وہ پاکستان کی قومی زبان نہ صرف بولتے ہیں بلکہ لکھتے اور پڑھتے بھی ہیں علاوہ ازیں ان کے عملے کے افراد بھی متعدار دوداں ہیں۔ یہ سب پاکستانی کی ترقی وخوشحالی کے دل سے خواہاں ہیں۔ ان کا پاکستان کے بارے میں وسیع مطالعہ بھی ہے ہر پاکستانی سے وہ نہایت پرتپاک اور گرم جوشی سے ملتے ہیں۔ چینی قونصل خانے میں اکثر مختلف تقریبات اور خصوصی نشستوں کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں ہر مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے پاکستانیوں کو دعوت دی جاتی ہے اور قونصل جنرل اور دیگر سفارتکار کران نشستوں میں مختلف حوالوں سے پاکستان کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ اور مفید مشورے اور تجاویز بھی پیش کرتے ہیں کاش ہم ان کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر پاکستان میں صنعتی اور زرعی انقلاب برپا کرنے کی توفیق پاسکیں اور غیر ملکی قرضوں سے جان چھڑا سکیں اے کاش!

دہشت گردی کا خاتمہ کیسے ہوگا

گزشتہ ہفتے ملک بھر میں اچانک ایک بار پھر دہشت گردی شروع ہوگئی کراچی، لاہور، ملتان، پشاور، ڈیرہ اسماعیل خان اور گجرانوالہ میں ہونے والی یکساں نوعیت کی کاروائیوں نے ملک بھر میں تشویش کی لہر دوڑا دی ہے۔ کاروائیوں کی مماثلت یہ ثابت کر رہی ہے کہ آگ اور خون کا کھیل کھیلنے والے ایک ہی ہیں اور ان کے مقاصد بھی جدا نہیں تمام شہروں میں مساجد اور امام بارگاہوں میں مصروف عبادت معصوم شہریوں پر اندھا دھند فائرنگ کر کے ان کا لہو اچھالا گیا۔ اس کھیل کو مسلمانوں کے دو فرقوں کو باہم لڑانے کے علاوہ اور کیا نام دیا جا سکتا ہے؟ یہ بات قابل غور ہے کہ پاکستان اور ایران کے درمیان جب کبھی ایسے معاملات ہونے لگتے ہیں کہ جن کے نتیجے میں دونوں برادر اسلامی ملکوں کے درمیان پہلے سے موجود برادرانہ تعلقات کو مزید وسعت اور استحکام حاصل ہو' کوئی نامعلوم ہاتھ حرکت میں آتا ہے اور ایسے واقعات رونما ہونے لگتے ہیں جو گزشتہ ایک ہفتے میں ملک کے مختلف شہروں میں پیش آئے اور جن کی جس قدر مذمت کی جائے، کم ہے

بھارتی زرائع ابلاغ خصوصا الیکٹرانک میڈیا ایسے واقعات کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے اور درندہ صفت غیر ملکی ایجنٹوں کی ان بہیمانہ وارداتوں کو مسلمانوں کی باہمی قتل وغارت گری قرار دے کر دنیا بھر میں اسلام اور پاکستان کو بدنام اور مسلمانوں کو دہشت گرد باور کرانے کی ناپاک کوشش کرتا ہے

دوسرا تاثر یہ دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ بھارت میں مسلمان پاکستان سے زیادہ محفوظ و مامون ہیں اور ہندوؤں کے ساتھ بھائیوں کی طرح رہ رہے ہیں۔ اس طرح بالواسطہ طور پر دوقومی نظریہ پر وار کیا جاتا ہے جو پاکستان کے قیام کی بنیاد ہے۔

ایک طرف بھارتی میڈیا کا یہ کردار ہے' دوسری جانب پاکستانی الیکٹرانک میڈیا پر نامعلوم مصلحتوں کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ایسی خبروں کی خاطر خواہ کوریج نہیں کی جاتی بلکہ بھارتی پروپیگنڈہ کے جواب میں بھی مکمل

خاموشی نظر آتی ہے ایک گھنٹے کے خبرنامے میں 45 منٹ حکومت اور وزیراعظم کے کارناموں اور ان کی تعریفوں کے پل باندھنے میں ختم ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی عوام ہندوستانی ٹی وی چینل دیکھنے پر مجبور ہیں اور ان کے خبرناموں پر زیادہ یقین کرتے ہیں ہمارے ٹیلی ویژن کے ارباب بست وکشاد معلوم نہیں کب معاملات کی نزاکتوں کو سمجھیں گے اور حقائق پر مبنی خبریں پیش کرنے کی توفیق پائیں گے۔ پوری دنیا میں خبرنامہ سب سے اہم ہوتا ہے جس میں اپنے ملک کی خبریں خواہ وہ حکومت کے موافق ہوں یا مخالفت میں عوام تک پہنچائی جاتی ہیں خود زی ٹی وی پر اپوزیشن کو مکمل کوریج دیجاتی ہے اور سب کو اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی کھلی آزادی ہوتی ہے۔ حکومت کو کھل کر تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور کوئی قیامت نہیں ٹوٹتی مگر ہمارا ٹی وی ہر دور میں حکومت وقت کے کنٹرول میں رہا ہیلہٰذا فطری طور پر حکومت ہی کے گن گاتا رہا ہے اسے کوئی پروا نہیں کہ ''خبرنامے'' سے لوگوں کا اعتماد اٹھ گیا ہے، اور وہ دوسرے ممالک کے ٹی وی چینلوں سے پیش کی جانی والی خبریں سنتے اور ان پر اعتماد کرتے ہیں۔ دہشت گردی کی وارداتوں کی طرح اب یہ معمول بن کر رہ گیا ہے کہ ہمارے حکمران اور امن وامان کے قیام کے ذمہ داران دہشت گردی کے ہر واقعے کا الزام ہندوستانی 'را' اور اسرائیلی 'موساد' پر جڑ دیتے ہیں اور بلند بانگ دعوے کیئے جانے لگتے ہیں کہ دہشت گرد قانون کی آہنی گرفت سے نہیں بچ سکیں گے جن کے پیارے جان سے گزر جاتے ہیں ان کو لاکھ دو لاکھ فی کس معاوضہ دے کر معاملہ ٹھنڈا کر دیا جاتا ہے۔ اور مجرم قانون کی آنکھ میں دھول جھونک کر غائب ہو جاتے ہیں سوال یہ ہے کہ آخر یہ 'را' کے ایجنٹ کون اور کس طرح نصف درجن سیکورٹی کے اداروں کی موجودگی میں اپنا کام کر جاتے ہیں اور پکڑے نہیں جاتے؟ اسلام تو تمام مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت کا حکم دیتا ہے کجا کہ ایک فرقہ دوسرے فرقے کی مساجد اور درس گاہوں کو نشانہ بنائے حقیقت یہ ہے کہ ہماری انتظامیہ بالکل بے بس ہے نصف درجن ایجنسیاں آج تک یہ نہیں معلوم کر سکیں کہ یہ 'را' کے ایجنٹ کہاں سے آتے اور کہاں چلے جاتے ہیں۔ ہمارا نیٹ ورک مفلوج ہو چکا ہے ہم اپوزیشن کے جلسے جلوس روکنے اور ان کو گرفتار کرنے میں تو بڑے ماہر ہیں۔ مگر ''را اور موساد'' کے ایجنٹوں پر ہمارا کوئی بس نہیں چلتا آخر کب تک ان شہریوں کا خون بہتا رہے گا اور ہم 'را' اور 'موساد' پر الزام ڈال کر اپنی جان چھڑاتے رہینگے اس قدر جدید ہتھیار کسطرح شہروں میں پہنچائے جاتے ہیں کون کون اس میں ملوث ہے؟ اور یہ گھناؤنا کاروبار بڑے پیمانے پر ہر شہر میں پھیلا ہوا ہے اس میں بعض مذہبی تنظیمیں بھی شامل ہیں اسی وجہ سے ایک فرقہ کا دوسرے فرقے کے ساتھ تناؤ رہتا ہے اور معصوم اور بے گناہ شہری اور نمازی مارے جاتے ہیں یہ عمل زیادہ تر صبح صبح پلاننگ کے ساتھ بار بار دہرایا جاتا ہے پہلے

یہ کبھی کبھار ہوتا تھا اور کراچی میں اکثر ہوتا تھا مگر اب تو ہر چھوٹا بڑا شہر اس کی زد میں آچکا ہے دس بیس افراد کا مرنا روزمرہ کا معمول بنتا جارہا ہے۔ اخبارات اس سے بھرے پڑے ہیں اور اب تو ایسا لگتا ہے کہ عوام اسکے عادی ہو چکے ہیں۔ کیونکہ مہنگائی اور بے روزگاری نے چھوٹے طبقے کو ایسا جکڑ کر رکھ دیا ہے کہ محض دو وقت روٹی کی فراہمی ان کا پہلا اور آخری مسئلہ رہ گیا ہے۔ پہلے کسی معمولی واقعے پر بھی عوام کا ردعمل بہت شدید ہوتا تھا احتجاجی مظاہرے ہوتے جلوس نکالے جاتے حکومت اور انتظامیہ کو واقعے کا نوٹس لینے اور کاروائی پر مجبور ہونا پڑتا تھا مگر اب عوام کی خاموشی نے انتظامیہ اور پولیس کو بالکل بے حس بنا کر رکھ دیا ہے وزیراعلیٰ پنجاب حالیہ واقعات کا الزام طالبان پر لگا رہے ہیں وزیر داخلہ اسے 'را' کے ایجنٹوں کا کارنامہ بتا رہے ہیں۔ عوام خاموش تماشائی بنے سہمے ہوئے ہیں۔ جب خود وزیراعظم صاحب کے دورے سیکورٹی رسک کے پیش نظر ملتوی ہو جائیں تو عام آدمی بھلا کس شمار قطار میں۔ خدارا اسکا سدباب کریں اور عوام کو اس خوفناک عذاب سے نجات دلائیں۔ خود ہم اپنے ملک میں محفوظ نہیں تو غیر ملکی یہاں کیسے آئینگے غیر ملکی سرمایہ کاری کیسے ہوگی؟ کاروبار کیسے ہوگا؟ دہشت گردی کا یہ کھیل نہتے اور معصوم عوام کے ساتھ کب تک کھیلا جائیگا؟ اس کا جواب کس سے لیا جائے۔ کون دے گا؟

بھاری مینڈیٹ کا انجام یا نروس 99ء

ستمبر 99ء کے شروع ہی سے اسلام آباد میں دبے دبے لفظوں میں میاں نواز شریف کی حکومت کے جانے کی خبریں آنا شروع ہو چکی تھیں۔ وزیراعلیٰ پنجاب شہباز شریف کبھی ڈپٹی وزیراعظم کا اور کبھی وزیر خارجہ کا کردار ادا کر رہے تھے۔ امریکہ کے پے در پے دورے کر کے امریکی حکومت کی آشیر باد لے رہے تھے۔ وزیر اطلاعات بار بار حکومت جانے کی تردید کر کے اپنا قد بڑھا رہے تھے دیگر وزراء بھی اس میں پیش پیش تھے مگر شریف برادران اندر سے ہلے ہوئے تھے۔ غیر ارادی طور پر اپنے اعصاب پر قابو رکھ کر روز یہ کہتے تھے کہ نواز شریف کو کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ یہ صرف اپوزیشن کا پروپیگنڈہ ہے۔ جلدی جلدی شطرنج کے مہروں کی طرح چالیں بدل رہے تھے کیونکہ وہ پونے تین سالہ دور حکومت میں اس میدان میں تقریباً سب کو مات دے کر سب سے بڑے شاطر بن چکے تھے۔ اب ان کے سامنے صرف اور صرف فوج کا خوف باقی رہ گیا تھا۔ اس سے بچنے کے لئے انہوں نے دو بڑے جنرل فارغ کئے۔ کچھ ردعمل دیکھنے میں نہیں آیا۔ تو سوچا کہ چلو آخری چال موجودہ آرمی چیف کو خوش کرنے کے لئے جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی کا 2001ء تک چیئرمین نامزد کر دیا جائے۔ جس پر جنرل پرویز مشرف نے وزیراعظم کا شکریہ بھی ادا کیا۔ مگر دونوں بھائیوں کے دل میں چور تھا کہ جنرل پرویز مشرف کے تیور کچھ بدلے سے لگتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ آرمی چیف دیگر خوشامدیوں کی طرح ان کے آگے پیچھے دم ہلاتا رہے۔ اس کے لئے انہوں نے سری لنکا کے دورے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ سوچ کر کہ آج تک وہ کسی مورچہ سے ناکام نہیں لوٹے اور مرد بحران کا لقب پانے کے بعد اس بھیانک فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انہوں نے ضیاء الدین کا انتخاب کیا جو گزشتہ کئی ماہ سے ان کے ساتھ ہر دورے پر جاتا تھا اور آئی ایس آئی کا سربراہ ہونے کے ساتھ ساتھ میاں شریف کا خیر خواہ بھی تھا مگر اس آخری کھیل نے پوری کی پوری بازی الٹ دی اور وہ پھندہ جو انہوں نے جنرل پرویز مشرف کے لئے تیار کیا تھا۔ آرمی نے

بڑی مہارت اور چابکدستی کے ساتھ میاں برادران کے گلے میں ڈال دیا اور فوج کو آپس میں لڑانے کی بھونڈی کوشش کو ناکام بنا دیا جس کا ذکر قارئین میں نے گزشتہ کالموں میں کئی بار کیا تھا اور ایک جملہ لکھا تھا کہ موجودہ حکومت کے مینڈیٹ سے مین الگ ہو گئے ہیں۔ اب صرف ڈیٹ باقی ہے جو زیادہ دور نہیں لگتی۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ میاں نواز شریف کی حکومت کی اس دو ی ٹرم میں کیا کیا گل کھلائے گئے۔ باوجود اس کے کہ مسلم لیگ کو صرف 12 فیصد عوام نے ووٹ دیئے تھے اور باقی تمام دیگر پارٹیوں کو 14 فیصد ووٹ دے کر عوام نے الیکشن سے بیزاری کا ثبوت دیا تھا کیونکہ تین چوتھائی یعنی 74 فیصد عوام نے الیکشن میں حصہ بھی نہیں لیا تھا۔ اس وجہ سے وہ خاموش تماشائی بنے رہے۔ مگر 12 فیصد عوام نے یک طرفہ مسلم لیگ کو ووٹ ڈالے تو مینڈیٹ اتنا بھاری ہو گیا جس کو مسلم لیگ برداشت نہیں کر سکی اور پورا ملک میاں شریف اینڈ سنز بن گیا۔ سب سے پہلے حملے میں نواز شریف کے سب سے بڑے محسن صدر فاروق لغاری سے خوبصورتی کے ساتھ انکے تمام اختیارات (258 ب) چھین لئے گئے پھر اپوزیشن کا پوسٹ مارٹم احتساب سیل سے یکطرفہ شروع کر دیا گیا جو تادم تحریر کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ پھر عدلیہ کی جنگ آپس میں لڑوا کر سابق چیف جسٹس کو رسی باندھ کر فارغ کر دیا گیا۔ اس کے بعد خود میاں نواز شریف کے اتحادیوں سے دو دو ہاتھ کئے گئے۔ سب سے پہلے اے این پی کے ساتھ سرحد میں بدعہدی کی گئی اور پختون خوا کا وعدہ کر کے انکار کر دیا گیا۔ اے این پی ناراض ہو کر مرکز سے علیحدہ ہو گئی۔ پھر ایم کیو ایم کو داؤ پر لگایا گیا۔ سندھ میں خود مسلم لیگ کی حکومت' جو ایم کیو ایم کی وجہ سے ملی تھی۔ لیاقت جتوئی کو ہٹا کر گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔ تمام وزراء کو بشمول ایم کیو ایم فارغ کر دیا گیا جب گورنر راج سے مطلوبہ فائدہ نہیں پہنچا تو بدنام زمانہ سابق وزیر اعلیٰ غوث علی شاہ کو مشیر اعلیٰ برائے وزیر اعظم بنا کر ایک مرتبہ پھر سندھ پر یلغار کی گئی اور پورے سندھ کو مرکز کا تابع بنا کر احساس محرومی کو ابھارا گیا۔ چیف سیکریٹری اور پولیس کے سربراہ مرکز سے بھیج کر سندھ کے عوام کی بے عزتی کی گئی۔ ایم کیو ایم پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے تاکہ وہ کسی طرح غوث علی شاہ سے مک مکا کر کے دوبارہ حکومت میں شامل ہو جائیں مگر ایسا نہیں ہوا۔

شروع ہی سے تمام بڑے بڑے اداروں' جن میں پی آئی اے' پی ٹی وی' پاکستان اسٹیل ملز پاکستان کرکٹ کنٹرول بورڈ اور احتساب سیل پر اپنے بندے بٹھا دیئے گئے۔ گزشتہ کالم میں' میں نے پی آئی اے کی کارکردگی پر لکھا تھا کہ کراچی کا ایئرپورٹ جمبو جہازوں کا قبرستان لگتا ہے۔ جہاں پی آئی اے کے پندرہ بڑے بڑے جہاز ناکارہ بتا کر لائن سے کھڑے کر دیئے گئے ہیں اور بیس پچیس ہزار ڈالر روزانہ ادا کر کے دوسرے

ممالک کے جہاز چلائے جا رہے ہیں اور کچھ دنوں میں یہ ہمارے جہاز اونے پونے فروخت کر دیئے جائیں گے۔

پی ٹی وی کا خبرنامہ دراصل وزیر اعظم نامہ اور مشاہد نامہ بن چکا تھا۔ کبھی کبھی صدر صاحب کو بھی دکھا کر خوش کر دیا جاتا تھا۔ بیرون ملک تمام سفیر اپنی اپنی پسند کے لگا دیئے گئے تھے جن کو سفارت کی ابجد بھی معلوم نہیں تھی۔ ہماری کسی بھی اقتصادی پالیسی کا سر پیر نہیں تھا۔ صبح شام منی بجٹ' ڈیلی بجٹ بن گئے تھے۔ ایک وزیر کہتا تھا کہ بجلی اور گیس کے نرخ نہیں بڑھائے جائیں گے تو دوسرے دن وزیر خزانہ کا بیان آ جاتا تھا کہ ہم آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے مجبور ہیں اور تو اور خود تاجروں کے وزیر اعظم خود تاجروں سے جو وعدے کرتے تھے۔ وزیر خزانہ اس سے مکر جاتے تھے۔ ملک میں ستمبر کی کامیاب ترین ہڑتال نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ سابقہ حکومت سے عوام کا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ جی ایس ٹی کی رٹ صرف 0.75 فیصد ٹیکس سے منسلک کر کے چھوٹے تاجروں کو تو خاموش کر دیا گیا۔ مگر ہول سیلرز ڈسٹری بیوٹرز پر یہ تلوار لٹکتی چھوڑ دی گئی جو آج بھی لٹکی ہوئی ہے خود مسلم لیگیوں کے ساتھ نامناسب سلوک روا رکھا جس کی مثال میاں اظہر' اعجاز الحق' اعجاز شفیع کے علاوہ سینکڑوں خاموش کارکن اور عہدیداران ہیں۔ نظام حکومت گلی گلی محلہ محلہ نام نہاد خدمت کمیٹیوں سے چلانے کی کوشش کی گئی۔ بڑے بڑے بدنام زمانہ راتوں رات اس کے عہدیدار بن کر ایس ایچ او لگ گئے۔ علاوہ چند مثالوں کے زیادہ تر لوٹ مار کی گئی اور خود وزیر اعظم اور ان کے اہلکاروں نے بینک کھلوا کر پچھلی تاریخوں میں اربوں ڈالر ٹرانسفر کر دیئے۔ عوام سے کھربوں روپے بینکوں سے قرض لے کر جس میں خود نواز شریف اور ان کی فیملی سرفہرست ہے۔ قرض کھا گئے اور آج تک باوجود عدلیہ کے بار بار مانگنے پر کوئی لسٹ فراہم نہیں کی گئی۔ ریاست کے چوتھے ستون یعنی جرنلسٹوں' کالم نگاروں اور مالکان کو ہراساں کیا گیا۔ انکم ٹیکس اور پولیس سے دھمکایا گیا۔ کروڑوں روپے کے واجبات بتا کر ادارے سیل کئے گئے۔ اپنی پسند کے کالم نگاروں کو نوازا گیا۔ سویرے سویرے ہی سے چھوٹے اور خوشامدی کالم لکھوانے کا رجحان پیدا کیا گیا خود صبح سے ٹی وی پر محفل شہنشاہوں کی طرح اپنے حق میں قصیدے پڑھوا کر عوام کو یہ تاثر دیا گیا جیسے کہہ رہے ہوں کہ ''نواز شریف اور کچھ دکھاؤ عوام تمہارے ساتھ ہیں۔''

آخر میں شرمناک کارگل کی پسپائی بھی اسی حکومت کا ''کارنامہ'' تھی۔ جس پر قوم نہ روسکتی تھی نہ چپ رہ سکتی تھی اس کو بھی بڑی ڈھٹائی سے ٹی وی پر آ کر اپنا کارنامہ بتا کر خاموش کرنے کی چال چلی کہ ملک ایک بحران سے بچ گیا اور فوج کی ناکامی بتا کر فوج کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی حالانکہ ہندوستان کی پیشہ ور اور تمام

اسلحہ جات کی موجودگی میں ہماری فوج اور مجاہدین نے اس صدی کی سب سے کامیاب ترین جنگ لڑ کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ جنگ بدر اور جنگ کارگل میں یہی مماثلت تھی کہ تعداد اور ہتھیاروں کے سامنے ایمان سب سے بھاری رہتا ہے اور ثابت کر دکھایا کہ مسلمان بے تیغ بھی لڑ کر سرخرو ہوتا ہے۔

اب موجودہ صورتحال میں میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری افواج سے وہ کام لے جو ماضی کی حکومت نہیں کر سکی۔ خوشامدیوں سے بچے' سب سے پہلے ان نادہندگان سے عوام کی لوٹی ہوئی دولت واپس لے۔ ٹیکنوکریٹ اور صاف کردار والے ریٹائرڈ بیوروکریٹ فوج کے ریٹائرڈ جنرل اور عدلیہ کے جج صاحبان پر مشتمل افراد پر حکومت بنائی جائے جن میں تاجر' انجینئر' بینکار' صنعتکار اور صحافی شامل ہوں تاکہ احتساب کا عمل صاف اور شفاف کر کے پھر انتخابات کرائے جائیں۔ جب تک ہماری اقتصادی اور معاشی حالت درست نہیں کی جائے گی۔ ہم آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے عذاب سے نہیں نکل سکیں گے۔ ہمارے محب وطن عوام کی نظریں اب افواج پاکستان پر ہیں جنہوں نے آج تک مایوس نہیں کیا اور امید ہے کہ آئندہ بھی مایوس نہیں کریں گی۔ کیونکہ قوم نے دیکھا کہ میاں نواز شریف نے سیاست کو کرکٹ سمجھ کر کھیلا اور مینڈیٹ کا بھاری بلا ان سے سنبھل نہیں سکا اور اندھا دھند اسٹروک کھیل کر نروس 99ء کا شکار ہو کر میدان سے آؤٹ ہو گئے۔

پاکستان کے آب گزیدہ لوگ

ایک ہفتہ قبل نواز شریف کی حکومت ختم ہوگئی اور آرمی چیف جناب پرویز مشرف پاکستان کے چیف ایگزیکٹو ہو گئے۔ اس ایک ہفتے میں اخبارات اور ہمارے ٹیلی ویژن میڈیا میں زبردست تبدیلی دیکھنے میں آئی تو ایک شعر یاد آ گیا۔

بستی میں جتنے آب گزیدہ تھے سب کے سب
دریا کا رخ پلٹتے ہی تیراک ہو گئے

وہ کالم نگار اور تبصرہ نگار جو کل تک میاں نواز شریف کا دم بھرتے تھے ایک دم کسی نے رائٹ تو کسی نے لفٹ ٹرن لے لی اور کوئی بالکل یوٹرن ہو گیا اس پورے ہفتے کسی نے بھی سابق وزیراعظم کی تعریف میں کالم نہیں لکھا۔ جس نے ہمیشہ وزیراعظم کے ہر اقدام کو سراہا ان کے ساتھ ملکی اور غیر ملکی دوروں میں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہا بلکہ بعض اوقات ان کے غیر ملک سے واپس آنے کے بعد دو تین ہفتے مزید حکومت کے خرچ پر وہاں ہوٹلوں میں ٹھہرا رہا۔ جسے کل تک بے نظیر اور پی پی سے ازلی بیر تھا۔ ان تمام جرنلسٹوں کو میاں صاحب میں کوئی خامی نظر نہیں آتی تھی آج خامیاں ہی خامیاں نظر آ رہی ہیں۔ میاں صاحب کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا اور ویسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ سب سے زیادہ تو مجھے پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگرام اور میڈیا منیجروں پر تعجب ہے بلکہ غصہ آ رہا ہے کہ کس ڈھٹائی سے لوگوں کو اپنے اپنے پروگراموں میں لا کر میاں نواز شریف میں کیڑے نکال کر ان پر تنقید کروا رہے ہیں کہ اقتصادی اور معاشی طور پر مسلم لیگ حکومت نے ملک کو اقتصادی و معاشی طور پر تباہ کر دیا ہے۔ ہماری پوری دنیا کے سامنے کوئی کریڈیبلٹی (Credibility) نہیں رہی۔ دونوں بھائیوں' بشمول تمام وزراء نے مل کر ملک لوٹ لیا اور جناب پرویز مشرف نے پاکستان کے نجات دہندہ بن کر زبردست قدم اٹھایا اور ان لٹیروں سے نجات دلا دی وغیرہ وغیرہ نہ جانے ہمارا ٹی وی کہاں کہاں ان خوشامدی لوگوں کو چھپا کر

رکھتا ہے۔ اسے ایک ہفتے پہلے تک یہ لوگ کیوں نظر نہیں آئے تھے۔ جب ملک میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا۔ قوم نے آرمی چیف کی اردو اور انگریزی دونوں تقریریں سنیں۔ بے جا تعریف کا میں ہرگز قائل نہیں اور صحیح بات ماننے میں بخل سے بھی کام نہیں لیتا۔ جنرل صاحب نے بڑی پرمغز تقریر کی۔ ہر بات کی وضاحت کی۔ وہ پہلے پاکستانی سربراہ ہیں۔ جنہوں نے کہا کہ پاکستان غریب ملک نہیں ہے اور نہ ہمارے عوام غیر محبِّ وطن ہیں ہمارا ملک الحمدللہ اناج اور خوراک میں خود کفیل ہے۔ زمین کے اندر اور زمین کے باہر ہمارے پاس معدنیات کے ذخائر اور گیس پیٹرول سب چیزیں موجود ہیں۔ ہم صحیح طریقہ سے اپنے وسائل استعمال نہیں کر رہے ہیں۔ ہمارے سیاست دان خود اربوں روپے کھا گئے ہیں جو قرض لیتا ہے۔ وہ واپس نہیں کرتا۔ انہوں نے چار ہفتے کا ٹائم دیا ہے۔ میرے خیال میں اگر کوئی نادہندہ اس رقم کا چوتھائی حصہ بھی لوٹانا شروع کر دے تو اس کو مزید ٹائم دے دینا چاہئے۔ مگر وہ بھی چند ماہ کا تاکہ وہ اپنی پراپرٹی آسانی سے بیچ سکے۔ اس میں کوئی رکاوٹ یا قباحت نہیں ہے۔ جہاں دس سال ہو گئے ہیں وہاں چند ماہ میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جنرل صاحب نے ہندوستان کو بالکل لاجواب کر کے جرات مندانہ جنگی حکمت عملی اپنائی اور فوج کی یک طرفہ واپسی کا اعلان کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم کسی بھی طرح کشمیر کا مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حل کر لیں تو یہ دونوں ملکوں کے لئے ایک نعمت سے کم نہیں ہوگا۔ آخر ہم کب تک پڑوسی ہوتے ہوئے لڑتے رہیں گے اور دونوں طرف سے جان اور مال کا نقصان برداشت کرتے رہیں گے۔

جنرل صاحب نے سب سے زیادہ بیرونی سرمایہ کاروں کی ضرورت پر زور دیا ہے مگر جب تک ہمارے ملک میں لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ حل نہیں ہوگا باہر سے سرمایہ کار کیسے آئے گا لہٰذا سب سے پہلے ہم کو انقلابی تبدیلیاں لانی پڑیں گی جس سے ملک میں قانون کی حکمرانی ہو سکے۔ ہم کو پولیس ڈیپارٹمنٹ کو ختم کر کے نئے پڑھے لکھے نوجوان مقامی لوگوں پر مشتمل نئی فورس روشناس کرانی پڑے گی۔ دس پولیس والوں کی جگہ ایک پولیس افسر جس کی تنخواہ کم از کم بیس ہزار روپے کے برابر ہو بھرتی کر کے اس کی ابتداء بڑے بڑے شہروں سے کرنی ہوگی۔ پولیس کے اختیارات کم کرنے ہوں گے۔ عوام کی عزت مال اور جان کی حفاظت اس کی ذمہ داری ہوگی جس طرح ہم نے پولیس لائژن کمیٹی (CPLC) بنائی۔ اس سے اغواء کی وارداتیں کم ہوئیں اور جرائم میں بھی کمی ہوئی تھی۔ اگر اس کا دائرہ کار پورے کراچی میں بڑھا دیا جاتا تو یقیناً جرائم میں کافی کمی ہوتی ہم کو اس کے لئے جدید آلات اور پڑھے لکھے لوگ درکار ہیں۔ ہم پولیس میں اچھی شہرت رکھنے والے لوگوں سے مدد لے کر یہ کام کر سکتے ہیں۔ مگر پولیس کا پرانا فرسودہ نظام ختم کرنا ہوگا۔

بیرون ملک ہمارے پاکستانی بڑے محبِّ وطن ہیں۔ ہندوستان کی طرح ہمیں بیرون ملک VIP پاسپورٹ اور VIP کارڈ جاری کرنے چاہئیں اور اس کی فیس صرف ایک ہزار ڈالر رکھنی چاہئے۔ ہمارے لاکھوں پاکستانی اس کو فخر سے اپنے پاکستان کی خاطر خریدیں گے۔ اس طرح کروڑوں ڈالر ہمارے پاس جمع ہو سکیں گے اور اسی طرح بیرون ملک پاکستانی تاجروں سے اپیل کرنا چاہئے کہ وہ پاکستان کو آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے نجات دلانے کے لئے حکومت پاکستان کے فنڈ میں عطیات دیں ماضی کی حکومت چونکہ خود چور تھی اس لئے کسی نے توجہ نہیں دی اور جو پیسہ ملا بھی وہ سب مل کر کھا گئے۔ مگر مجھے امید ہے کہ جنرل صاحب کی اس آواز پر لاکھوں پاکستانی ملک کے اندر اور باہر یقیناً اتنا سرمایہ فراہم کر سکتے ہیں جس سے ہم 32 ارب ڈالر کا قرضہ اتار سکیں۔ اس کے لئے ہم کو مزید سادگی اپنانا ہوگی۔ تمام بڑے بڑے ادارے پاکستان اسٹیل، پی ٹی وی، گیس کمپنی، واپڈا۔ کے پی ٹی۔ پی آئی اے۔ پورٹ قاسم سب کو نجی شعبے کے حوالے کر کے جان چھڑائی جائے اور اس سے ملنے والی رقم سے قرضوں کی ادائیگی کی جائے۔ ساتھ ساتھ اسلام آباد اور دوسرے بڑے بڑے شہروں میں رہائشی پلاٹ غیر ملکی پاکستانیوں کو فارن کرنسی میں الاٹ کئے جانے چاہئیں۔ یہ بیرون ملک پاکستانی، پاکستان کے اندر سرمایہ کاری میں بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔ مگر ہمارے سفارتکاران سے بڑی حقارت سے پیش آتے ہیں۔ اور کمرشل اتاشیوں کو پابند کیا جائے کہ وہ ان پاکستانی تاجروں سے مل کر ملک میں سرمایہ کاری کے لئے راہ ہموار کریں اور ہر سفارتخانے میں شکایت کی کتاب رکھوائی جائے جو پاکستانی بیرون ملک سے اپنے ملک واپس آئے۔ اس کو ایئرپورٹ پر تنگ کرنے کے بجائے بڑی عزت سے اس کے ساتھ پیش آنا چاہئے۔ خواہ وہ تاجر ہو، انجینئر ہو، ڈاکٹر یا مزدور ہی کیوں نہ ہو کیونکہ وہ ہمارے لئے زرمبادلہ پیدا کر رہا ہے۔ اسی طرح ہر کمرشل اتاشی کو ٹارگٹ دیئے جائیں اور جو ٹارگٹ پورا نہ کرے اس کو ملک واپس بلا لینا چاہئے۔ تمام سازشی خوشامدی اور سفارشی سفارتکاروں کو بلا امتیاز واپس بلانا چاہئے۔ تمام سازشی خوشامدی اور سفارشی سفارتکاروں کو بلا امتیاز واپس بلانا چاہئے۔ ملک کے اندر غیر ضروری اشیاء کی درآمد پر پابندی ہونی چاہئے۔ غیر ملکی کرنسی کو مارکیٹ میں کھلا چھوڑ دینا چاہئے۔ امپورٹر خود یہ کرنسی خرید کر ایل سی کھولے اور ایکسپورٹر اپنی کرنسی مارکیٹ میں فروخت کرے۔ حکومت کوئی زرمبادلہ نہ فراہم کرے۔ اس کے لئے ایکسپورٹر کو مراعات دی جائیں تاکہ ہم زیادہ سے زیادہ زرمبادلہ لا سکیں۔ پرائم منسٹر ہاؤس، چیف منسٹر و گورنر ہاؤس، قصر صدارت، غیر ممالک میں رہنے والے پاکستانیوں کے ہاتھ فروخت کر کے ان کو ہوٹلوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ اسی طرح بڑے بڑے کمشنر ہاؤس، ڈی سی ہاؤس سب کو فروخت کر کے ایک مرتبہ آئی ایم ایف

ورلڈ بینک سے جان چھڑالی جائے موٹر وے' اپنا گھر' پیلی ٹیکسیاں' ٹریکٹر اسکیمیں ختم کردیں اور ماضی کی حکومت سے حساب لیا جائے کہ کتنا پیسہ رشوت کا ان اسکیموں پر لیا گیا۔ وہ واپس لیا جائے۔ اسمگلنگ اور رشوت کا سلسلہ ختم کیا جائے۔ زیادہ ٹیکس لگانے کی عادت کم کرکے زیادہ سے زیادہ انکم ٹیکس' سنگاپور' ہانگ کانگ اور سوئٹزرلینڈ کی طرح صرف 15 فیصد وصول کیا جائے۔ عدالتوں کا نظام بہتر بنایا جائے اور مقدمات کی مدت 3 ماہ مقرر کی جائے۔ اگر کوئی مقدمہ طویل ہوجائے تو اس کی باز پرس کی جائے تاکہ عام آدمی عدالت کے دھکے نہ کھائے۔ مذہبی تنظیموں کے درمیاں بھائی چارے کی فضاء پیدا کی جائے اور ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی' جلسہ جلوس' پمفلٹ پر مکمل پابندی عائد کی جائے۔ اگر جنرل صاحب آپ نے عوامی مشاورتی کمیٹیاں بنا کر پورے ملک میں اس کا جال بچھا دیا تو انشاء اللہ پاکستان نہ صرف خوشحال ہوگا بلکہ عالم اسلام کے دیگر ممالک کے لئے ایک نمونہ ہوگا۔ اس کے لئے صرف آپ کو اچھے لوگوں کی ٹیم درکار ہے جن کی ہمارے وطن عزیز میں کمی نہیں۔ آیئے آگے بڑھیئے اللہ آپ کا نگہبان ہوگا قوم آپ کی مشکور ہوگی۔ پھر آرام سے الیکشن کروا کر صاف اور شفاف لوگوں کو اقتدار حوالے کرکے سرخرو ہوجایئے گا۔ فی الحال قوم کو غربت' افلاس' بیماری' بے روزگاری' مہنگائی' دہشت گردی سے نجات دلائیں۔ ''پہلے احتساب پھر انتخاب'' کا نعرہ ہی ہماری معیشت کو مضبوط کرسکتا ہے لیکن یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ جھوٹے وعدے اور کھوکھلے نعرے سن سن کر قوم تھک چکی ہے۔

چند قابل عمل تجاویز

پاکستان کے موجودہ چیف ایگزیکٹو جناب پرویز مشرف صاحب کو چارج لئے ہوئے چار ہفتے گزرنے والے ہیں مگر ابھی تک کسی بھی ڈیفالٹر کی طرف سے کوئی پیشکش سامنے نہیں آئی اور نہ ہی کوئی ایسا سخت قانون یا آرڈیننس سامنے آیا ہے جس سے ڈر کر ڈیفالٹر لوٹی ہوئی رقمیں واپس بینکوں میں جمع کرائیں اور ملک کی معاشی حالت سدھرے یہ المیہ ہے کہ غریبوں کو تو یہی بینک والے مع سود اپنی رقم وصول کرنے میں مستعدی دکھاتے ہیں اور ان کی جائیدادیں نیلام کرکے اپنی رقم ہر حالت میں وصول کرلیتے ہیں مگر ان امیر اور سیاسی اثر ورسوخ رکھنے والے نادہندگان کو نہ صرف سود معاف کردیتے ہیں بلکہ اصل رقم بھی معافی کے کھاتے میں ڈال کر مک مکا کرلیتے ہیں۔

پاکستان دنیا کا عجیب ملک ہے جہاں 22 فیصد سے لے کر 36 فیصد تک سود وصول کیا جاتا ہے۔ جبکہ پوری دنیا میں 7 فیصد سے لے کر 10 فیصد تک سود لیا جاتا ہے اسی وجہ سے یہاں بڑی صنعتیں یا تو لگ نہیں سکتیں۔ اگر لگ جائیں تو بھاری سود کی وجہ سے پنپنے نہیں پاتیں اور پہلے دن سے خسارہ شروع ہوجاتا ہے پھر چار پانچ سال میں صرف ٹوٹی پھوٹی بلڈنگ اور زنگ آلود مشینری رہ جاتی ہے بینک ان اشیا کو نیلام کرکے اپنا قرضہ وصول کرنے کی کوشش کرتا ہے یا پھر اوپر سے دباؤ ڈلوا کر قرضہ معاف کروالیا جاتا ہے کہ یہ سلسلہ ضیاء الحق کے دور میں محمد خان جونیجو کی حکومت سے شروع ہوا اور آج تک جاری ہے اگر اس مرتبہ یہ قرضے وصول نہ ہوئے تو کبھی وصول نہیں ہوسکیں گے۔ اور یہ فیشن امیروں اور سیاست دانوں سے نکل کر عام تاجروں میں بھی شروع ہوجائے گا جس کی کوئی حد باقی نہیں رہے گی۔ لہٰذا جس طرح بھی ہو قرضوں کی وصولیابی میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔ ایک ایک پائی وصول ہونی چاہئے۔ البتہ قسطوں میں اضافہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

میں نے گزشتہ کالم میں لکھا تھا کہ پاکستان کے غریب عوام کو نہ ان نادہندگان سے کوئی غرض ہے جنہوں

نے بینکروں سے مل کر اربوں روپے ہضم کئے ہیں۔ اور نہ ہی احتساب (Accountibility) سے غرض ہے اور نہ ہی وہ جمہوریت، الیکشن یا ریفرینڈم میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے امیر المومنین کی تلاش میں ہیں جو ان کی غربت ختم کرائے جو ان کی لوٹی ہوئی دولت جعلی کوآپریٹو سوسائٹی اور جعلی فنانس کمپنیوں سے واپس دلائے جس کے لاکھوں متاثرین اپنے زندگی بھر کے اثاثوں سے محروم ہو گئے ہیں اور جعلی کمپنیوں کے مالکان پولیس اور ایف آئی اے سے مل ملا کر روپوش ہو گئے ہیں۔ اگر موجودہ حکومت نے ان معصوم اور مظلوم لوگوں کو ان کی رقمیں واپس دلا دیں تو یہ یقیناً ایک لائق تحسین اقدام ہوگا اور موجودہ حکومت کے لئے ایسا کرنا کچھ مشکل بھی نہیں ہے۔ جبکہ اربوں روپے کی جائیدادیں حکومت کی تحویل میں ہیں فوری طور پر ان جائیدادوں کو نیلام کر کے متاثرین کو ان کی رقوم کی جس قدر بھی ممکن ہو واپسی کو یقینی بنایا جائے۔

غریب عوام کا دوسرا بڑا مسئلہ مہنگائی اور بے روزگاری ہے۔ مہنگائی کی ذمہ داری خود حکومت پر بھی عائد ہوتی ہے جس نے گیس بجلی اور پیٹرول جیسی بنیادی ضرورت کی اشیاء پر بھاری ٹیکس لگائے جس کا براہ راست اثر صارف (Consumer) پر پڑتا ہے ہر دور میں وزیر خزانہ ٹیکس لگاتے وقت یہ کہتے رہے ہیں کہ اس کا اثر غریب عوام پر نہیں پڑے گا سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا یہ ٹیکس فرشتوں سے وصول کیا جاتا ہے۔ جو اس کا اثر عوام پر نہیں پڑے گا؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے کہنے پر جو غیر ضروری ٹیکس لگایا گیا ہے وہ فوری طور پر واپس لیا جائے اور کھانے پینے اور بنیادی ضرورت کی اشیاء پر تمام ٹیکس ختم کئے جائیں۔ بے شک اس کے بدلے سامان تعیش اور غیر ضروری اشیاء پر دگنا ٹیکس لگا کر بجٹ کو متوازن کیا جا سکتا ہے۔ اس سے غریبوں پر خوشگوار اثر پڑے گا اور مہنگائی کا خاتمہ ہو سکے گا۔

مغربی ممالک میں جہاں ٹیکس وصول کیا جاتا ہے، تو لوگوں کو بے روزگاری الاؤنس دینا بھی حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اسلام میں اس کی نمایاں مثال بیت المال ہے۔ بیت المال کا موثر احیاء، مہنگائی، بیروزگاری اور جرائم میں نمایاں کمی کا سبب بن سکتا ہے۔ غریب مردوں، بیواؤں بالخصوص بے روزگار نوجوانوں کے لئے حکومت کی طرف سے بے روزگاری الاؤنس کا سلسلہ شروع ہونا چاہیئے امریکہ اور مغربی ممالک میں تاجروں اور صنعت کاروں سے بے روزگاری ٹیکس وصول کیا جاتا ہے لہٰذا اس ضمن میں فوری قانون سازی کی جانی چاہیئے اور جس کا موثر نفاذ ہونا چاہیئے۔

عوام کا تیسرا بڑا مسئلہ علاج معالجے کا ہے۔ ہمارے صوبائی اور مرکزی سپتالوں میں بعض معمولی گولیوں اور شربت کے علاوہ کوئی دوا موجود نہیں ہوتی جان بچانے والی ادویات تو ہوتی ہی نہیں ہیں۔ عملہ اربوں روپے

کی دوائیں بیچ کھاتا ہے اور غریب بغیر علاج کرائے مر جاتے ہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ غریب عوام کو علاج معالجہ کی تسلی بخش سہولت فراہم کرے اور ہسپتالوں میں دواؤں اور دیگر ضروری چیزوں کی موثر فراہمی کو یقینی بنائے۔ دواؤں کی چوری کی سختی سے روک تھام کی جائے۔ یہ تھیں چند ضروری اور فوری عمل کی متقاضی تجویزیں۔ ان تجاویز کا تعلق براہ راست عوام سے ہے۔ اگر ان پر عمل ہو جائے تو غریب عوام کا بھلا ہوگا اور حکومت بھی سرخرو ہو سکے گی۔

جنرل صاحب!

دہشت پھیلانے سے روکیں

اس وقت پوری حکومتی مشینری بینک ڈیفالٹروں کے پیچھے لگ چکی ہے۔ اخبارات کی خبروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ 17 نومبر کے بعد تمام ڈیفالٹر پکڑ لئے جائیں گے۔ ان سے ماضی (بیس سال) کے قرضے وصول کر لئے جائیں گے جنہوں نے رقم ادا نہیں کی۔ ان کی جائیدادیں ضبط کر لی جائیں گی وغیرہ وغیرہ۔

یہ اقدامات ویسے تو قابل ستائش ہیں کہ نادہندگی اور نادہندگان کا خاتمہ ہونا چاہئے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ قرضے آناً فاناً اور راتوں رات وصول نہیں ہو سکتے۔ اس وقت بے شک فوجی حکمرانوں کی وجہ سے ہل چل مچ گئی ہے۔ مگر چار ہفتے قطعی ناکافی ہیں۔ یا تو وصولی کی ہی نہیں جا رہی تھی اور اربوں کے قرضے معاف کر دیئے جاتے تھے یا اب ڈنڈا لے کر کھڑے ہو گئے ہیں' یہ طریقہ درست نہیں ہے۔ قرضوں کی وصولی کے لئے بینکرز کمیٹیاں بنائیں اور نادہندگان کو ملا کر قسطوں میں وصولی کریں۔ تو یقیناً یہ قرضوں کی واپسی کچھ وقت سے سہی' مگر ہو جائے گی۔ ہاں اگر قرضوں کی قسطیں کر دیئے جانے کے بعد بھی نادہندگان اقساط جمع نہ کرائیں بے شک ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔ میری تجویز ہے کہ قرضے کی رقم کی وصولی کی مدت زیادہ سے زیادہ ایک سال ہونی چاہئے۔ میں نے پچھلے کالم میں بھی لکھا تھا کہ بڑی بڑی صنعتیں بھاری سود یعنی 24 فیصد سے 30 فیصد تک لگانے کی وجہ سے بھی بند ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک فیکٹری قائم کرنے کے لئے بینک سے قرضہ لیا گیا۔ کئی سال عمارت بننے میں لگے۔ پھر مشینری کی درآمد کا مرحلہ آیا کئی ماہ اس میں لگ گئے اور پھر دیگر مراحل۔ اب اگر فیکٹری کے قیام میں تین سال کا عرصہ لگا ہے' تو ان تین برسوں میں لئے گئے قرضے پر سود تو چڑھتا رہا البتہ پیداوار کوئی نہیں ہوئی۔ لہٰذا اگر متعلقہ صنعتکار نے قرضہ 20 فیصد سود پر حاصل کیا تھا تو وہ ان

برسوں میں 60 فیصد ہو گیا۔ پھر فیکٹری میں کام شروع ہوا۔ پیداوار ہونے لگی۔ اب کیا ضروری ہے کہ فیکٹری فوری طور پر منافع دینے لگے۔ اس میں چند ماہ' چند سال بھی لگ سکتے ہیں مگر سود کا میٹر مسلسل گھوم رہا ہے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی رفتار بھی بڑھ رہی ہے۔ بڑھتی جا رہی ہے اور یہ سود صنعتکار کو بہرصورت ادا کرنا ہے۔ اس لئے حکومت کو چاہئے کہ سود معاف کر کے صرف اصلی رقم وصول کرے اس صورت میں بھی اربوں روپے کی وصولی ہو جائے گی۔ دہشت پھیلانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور پھر احتساب تو ان بینک افسران کا بھی ہونا چاہئے تھا اور زیادہ سخت ہونا چاہئے۔ جنہوں نے کمیشن لے کر یہ قرضے معاف کر دیئے تھے۔

قرضوں کی وصولی کی آڑ میں اب دیگر محکمے بھی دہشت پھیلا رہے ہیں۔ بجلی' پانی' سیوریج' گیس اور ٹیلی فون کے نادہندگان کو "قانونی کارروائیوں" کی دھمکیاں مل رہی ہیں جبکہ ان اداروں کی کارکردگی کا یہ حال ہے کہ بجلی کا بریک ڈاؤن معمول بن چکا ہے۔ پانی کئی کئی دن نہیں آتا۔ سڑکیں ٹوٹی پڑی ہیں۔ سیوریج کا نظام مفلوج ہے کیا کسی نے ان محکموں کے خلاف کسی کارروائی کی ضرورت محسوس کی۔ ان کا احتساب کون کرے گا؟

تمام سرکاری محکموں میں رشوت عام ہے جس میں بڑے بڑے افسران ملوث ہیں جس پر نہ کوئی ٹیکس ہے اور نہ کوئی پوچھ گچھ ہوتی ہے یوٹیلٹی بل بڑھا کر بھیجے جاتے ہیں پھر پیسے لے کر بل کو کم کیا جاتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ پورا پاکستان ڈیفالٹروں سے بھرا ہے حالانکہ بینکوں کے باہر دیکھئے بل دینے والوں کی قطاریں لگی ہوتی ہیں اور نہ دینے والے مزے سے گھر بیٹھے رہتے ہیں۔ عوام کی مشکل کا کوئی حل نہیں نکالا جا رہا ہے بلکہ فوجی حکومت کو بدنام کرنے کی سازش ہو رہی ہے۔ اسلام میں کہیں بھی امیر سے چھین کر غریب کو دینے کی اجازت نہیں ہے اور نہ ہی اسلام نظام زکوٰۃ کے علاوہ کسی ٹیکس کی سفارش کرتا ہے تمام روایتی ٹیکس انگریزوں کی ایجاد ہیں۔ اسلام غریب کو بیت المال سے وظیفہ مقرر کرنے کی ضرورت پر زور دیتا ہے امیروں سے 2½ فیصد زکوٰۃ وصول کر کے ہم معاشرے کو خوشحال بنا سکتے ہیں۔ مگر ہم نے اسلامی نظام کو پرے رکھ کر انگریزوں کے قوانین اپنا لئے ہیں۔ خلیج کی اسلامی ریاستوں میں آج بھی کوئی ٹیکس نافذ نہیں ہے۔ کیا وہ خوشحال نہیں ہیں؟ ان کے عوام بھوکے نہیں مر رہے۔ حکومت ان کی کفالت کرتی ہے۔ ان کی صرف تیل کی پیداوار ہے جبکہ ہمارے ہاں تیل' گیس' معدنیات تمام قسم کے اناج' پھل' سبزیاں' مویشی موجود ہیں۔ مگر ہمارے عوام بھوکے' پیاسے' تعلیم اور علاج و معالجے کی بنیادی ضرورت سے محروم ہیں۔ حکومت کیوں ان کی کفالت نہیں کرتی۔ ایسا نظام لانے کی ضرورت ہے۔ ہم نے بڑے بڑے قرضے لے کر عیاشیوں پر اڑا دیئے پھر اس کا بوجھ عوام پر ڈال دیا ہے۔

محترم جنرل صاحب! عوام کے لئے کوئی پیکج دیجئے جب تک بنیادی چیزیں سستی نہیں ہوں گی عوام دشواریوں کا

شکار رہیں گے اور مہنگائی کی ذمہ دار خود حکومت بھی ہے کیونکہ امپورٹ ڈیوٹیاں حکومت لگاتی ہے پیٹرول پر ٹیکس حکومت کا کارنامہ ہے۔ بجلی اور گیس کون مہنگا فراہم کر رہا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم ایکسپورٹ میں کافی پیچھے جا رہے ہیں۔ ہماری کوئی معاشی پالیسی نہیں ہے۔ کوریا کو لیجئے۔ اس نے پچیس سال پہلے ہمارا نظام اپنایا۔ آج وہ کہاں ہے اور ہم کہاں ہیں۔ جاپان اور جرمنی جنگیں ہار کر سب کچھ تباہ کر کے آج دوبارہ کہاں سے کہاں پہنچ چکے ہیں۔ ہماری فوج ایک نظام کے تحت چل رہی ہے۔ جس کی وجہ سے آج ہم الحمدللہ فوجی اعتبار سے مضبوط ہیں۔ مگر معاشی طور پر ہم بے حد کمزور ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایک ٹیم تیار کریں جو بزنس مین، بیوروکریٹ اور ٹیکنوکریٹ پر مشتمل ہو اور وہ آئندہ کی امپورٹ و ایکسپورٹ پالیسیاں بنائیں۔ بیرون ملک رہنے والے پاکستانی تاجروں اور ماہرین کو دعوت دیں کہ وہ پاکستان میں سرمایہ لگائیں۔ اسی طرح غیر ملکی سرمایہ کاروں کو دعوت دیں کہ وہ بھی ہمارے ملک میں بنیادی صنعتیں لگائیں لاء اینڈ آرڈر درست کریں۔ اس وقت چین میں زبردست سرمایہ کاری ہو رہی ہے جبکہ ہم یورپ اور چین دونوں کے درمیان ہیں۔ ہماری لیبر چین سے بھی زیادہ سستی اور محنتی ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ ہم سرمایہ کار نہیں لا سکے۔ کوریا اور جاپان خود باہر سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ ہمارے فیڈریشن کے وفود باہر بھیجے جائیں جو ان کو ترغیب دیں۔ جب تک ہم معیشت درست نہیں کریں گے۔ اکیسویں صدی میں داخل ہو کر بھی پیچھے بیٹھیں گے۔ جنرل صاحب! قدرت نے آپ کو ایک سنہری موقع دیا ہے۔ اس کو عوام کی فلاح و بہبود کے لئے اپنی ٹیم کے ساتھ وقف کر دیں۔ سیاسی میدان میں وقت ضائع کرنے کے بجائے جس طرح آپ نے فوج کو مضبوط اور کرپشن سے دور رکھا ہے۔ اسی طرح پاکستانی معاشرے کی بھی انقلابی رہنمائی کر کے مضبوط پاکستان بنا دیں تاکہ عوام خوشحالی کی زندگی گزاریں۔ ماضی کی تمام حکومتیں صرف اپوزیشن کو کچلنے میں وقت ضائع کرتی رہی ہیں۔ مقدمے بازی، دھونس اور کمیشن کھانے میں مصروف رہیں عوام کی کسی نے بھی فکر نہیں کی لہٰذا لوٹا ہوا پیسہ وصول کر کے عوام کی غربت دور کرنے کے لئے ٹھوس اقدامات کریں۔ تعلیم پر سب سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ اگر آپ ایک اچھی ٹیم بنانے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھ لیجئے کہ پاکستان اور اس کے عوام کا مستقبل تابناک ہو جائے گا اور اگر آپ بھی ماضی کی حکومتوں کی طرح سیاست میں الجھے رہے اور توڑ جوڑ کرتے رہے تو عوام کی آخری امیدیں بھی دم توڑ دیں گی۔ خدا ایسا وقت نہ لائے۔ آمین۔

گرفتاریوں کا پہلا ہفتہ

موجودہ حکومت نے اپنے وعدے کے مطابق 16 نومبر کی میعاد ختم ہوتے ہی بڑے بڑے نادہندگان کے خلاف کارروائی شروع کر دی، جو ایک اچھا قدم تھا کیونکہ صرف 6 ارب روپے وصول ہوئے تھے جبکہ ہدف تین سو ارب سے بھی زیادہ تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ نادہندگان ابھی تک سنجیدہ نہیں ہیں اور وہ ماضی کی طرح موجودہ حکومت کی انتباہ کو محض دھمکی سمجھ کر چپ چاپ بیٹھے رہے یا ملک سے فرار ہو گئے اگرچہ ابھی تک 2000 نادہندگان میں سے سوا سو کی گرفتاریاں ہوئی ہیں مگر اس وقت صنعت کاروں میں زبردست خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔ ہر شخص اپنے آپ کو ڈیفالٹر سمجھ رہا ہے۔ مارکیٹوں میں خریدار نہیں ہیں۔ ملک بھر میں کاروبار پہلے ہی ٹھپ ہو رہا تھا۔ ان گرفتاریوں سے بالکل ہی چوپٹ ہو گیا ہے۔ ایئرپورٹ پر ایک ایسے صنعتکار کو گرفتار کیا گیا جو نادہندہ نہیں تھا اور ایک صنعت کار کو واپس بھیج دیا گیا۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ حکومت کو اس میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے، کسی بھی صنعت کار کو بلاوجہ ہراساں نہیں کرنا چاہئے۔ میں نے پچھلے کالم میں بھی لکھا تھا کہ قرضے ضرور وصول کرنے چاہئیں مگر اس کے لئے ٹائم ٹیبل کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ایک ماہ میں کوئی بھی نادہندہ پوری رقم نہیں ادا کر سکتا۔ 10 فیصد لے کر ماہانہ اقساط کرنا ضروری ہے حکومت علاقائی چیمبر آف کامرس اور فیڈریشنوں کے ذمہ داروں سے مل کر اس کا حل نکالے اس وقت صنعت کار اور ٹیکس دینے والا مطعون کیا جا رہا ہے مگر چند ہزار نادہندگان کے برعکس لاکھوں صنعتکار اور تاجر ایسے ہیں جو بینک سے قرضے لیتے ہیں اور خوشی خوشی بھاری سود سمیت واپس کر رہے ہیں۔ یہ انہیں لوگوں کے دیانتدارانہ تعاون کا نتیجہ ہے کہ بینک بند نہیں ہوا جبکہ بہت سی صنعتیں بند ہو چکی ہیں۔ ان کا دیوالہ نکل چکا ہے مشینری اور جائیدادیں نیلام ہو چکی ہیں۔ دوسری طرف بینک اتنے بڑے بڑے قرضے معاف کرنے کے باوجود نہ صرف قائم و برقرار ہیں بلکہ ترقی پر ترقی کر رہے ہیں اور عوام کو بڑی بڑی اسکیمیں دے رہے ہیں۔ کوئی لکھ پتی بنا رہا ہے تو کوئی کروڑ پتی

بنانے کے خواب دکھا رہا ہے۔ گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں تو عام انعامی اسکیموں میں آ چکی ہیں جس کی واحد وجہ بھاری سود ہے اور یہی سود نادہندگی کا سبب بھی بنتا ہے۔ حکومت اور بینکوں کو چاہئے سب سے پہلے سود کی شرح عالمی برادری کی طرح دس فیصد کرے تاکہ ہم ایکسپورٹ بڑھا سکیں۔

یہ بات میری سمجھ سے بالا ہے کہ ان قرضوں کی وصولی سے حکومت معیشت کیسے بہتر بنا سکے گی کیونکہ بینک تو پرائیویٹائز ہو چکے ہیں۔ پیسہ بینکوں کو ملے گا تو بینک مالا مال ہوں گے۔ اس سے نہ تو عوام کو کوئی فائدہ ہوگا اور نہ ہی حکومت یا ہماری معیشت پر کوئی اثر پڑنے کا امکان ہے ہم کو اس وقت صحیح منصوبہ بندی کی ضرورت ہے کپاس کی فصل کا حال سب کو معلوم ہے اب ایک اور پریشانی یعنی گندم کی قلت کا سامنا کرنا ہوگا۔ افغانستان پر پابندیاں لگنے سے آٹا اسمگل ہوگا۔ سرحد میں آٹے کی قلت شروع ہوگئی ہے اگر فوری اقدامات نہ کئے تو عوام کا شدید ردعمل ہوگا اس سے بچنا ضروری ہے۔ اب پاکستان کے عوام کے ساتھ ساتھ ہم کو اپنے برادر ملک افغانستان پر آئی ہوئی ''پابندی کی آفت'' میں اس کا ساتھ دینا ہوگا۔ ایک مرتبہ پھر افغان عوام پاکستان آنے کی کوشش کریں گے۔ اس کی وجہ غربت اور پابندیاں ہوں گی۔ بہتری اسی میں ہے کہ ہم اس دہری آفت سے نکلنے کی کوشش کریں جب تک ہم اپنی پلاننگ صحیح سمت میں نہیں کریں گے اور معیشت کی بحالی کے لئے انقلابی اقدام نہیں کریں گے نہ حکومت مضبوط ہوگی اور نہ ہی عوام مطمئن ہوں گے۔ اگر دہشت اور خوف و ہراس کی فضا ختم نہیں کی تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ بڑے بڑے کارخانے بند ہونا شروع ہو جائیں گے۔ خدانخواستہ اگر یہ سلسلہ چل نکلا تو پھر مزید بے روزگاری بڑھنے کا قوی امکان ہے اس سے بھی عوام میں منفی ردعمل ہوگا اور فوجی حکومت بدنام ہوگی جو کسی صورت میں پاکستان کے لئے بہتر نہیں۔ ضرورت ہے کہ آہستہ مگر سوچ سمجھ کر اقدامات کئے جائیں گے۔ حکومت کے تمام شعبے عوام کے طابع کئے جائیں جیسا کہ مہذب ممالک میں ہوتا ہے ہر شخص عوام کو اور خاص طور پر ٹیکس دینے والوں کو جوابدہ ہوتا ہے جبکہ اس وقت صورتحال اس کے برعکس ہے پاکستان دنیا کا آخری ملک نہیں ہے جہاں نادہندگان پائے جاتے ہیں۔ امریکہ اور یورپ میں تو آئے دن بڑے بڑے ادارے حتیٰ کہ بینک تک دیوالیہ ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں تو الحمدللہ نادہندگان کی تعداد چند ہزار ہے جبکہ باہر کے ممالک میں ہر سال لاکھوں افراد کریڈیٹ کارڈوں کے نادہندگان ہوتے ہیں۔ مگر بینک ان سے ایسا سلوک نہیں کرتا جبکہ وہاں سود کی شرح بھی ہم سے ایک تہائی ہے میرے بار بار لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ صنعت کاروں کو اعتماد میں لیا جائے۔ سود کی شرح چھ سے دس فیصد کی جائے۔ قرضوں کی واپسی آسان اقساط میں کی جائے اور سب سے زیادہ خوف و ہراس کی فضاء ختم کی جائے۔ صنعت کاروں کو اعلیٰ درجے کا

شہری سمجھا جائے۔ ان کی عزت اور جان کی حفاظت کو ضروری بنایا جائے۔ کسی بھی انتقامی یا سخت رویے سے گریز کیا جائے تاکہ صنعت کاری کی طرف دوبارہ ترغیبات اور آسانیاں پیدا کر کے ملک کی معیشت کی بحالی کا بندوبست کیا جائے۔

روٹی، کپڑا اور مکان کی داستان

آج سے تیس سال پہلے ایک نعرہ لگایا گیا۔ روٹی، کپڑا اور مکان۔ پھر کیا تھا پاکستان کے غریب اور معصوم عوام جوق در جوق اس کے پیچھے چل پڑے یہ سوچ کر اگر ہم نے اس نعرے کا ساتھ دیا تو ہماری غربت ختم ہو جائے گی۔ ہم کو کھانے کے لئے مفت روٹی، پہننے کے لئے کپڑا اور رہنے کے لئے مفت مکان ملے گا۔ چنانچہ راتوں رات وجود میں آنے والی پارٹی اس نعرے کی بدولت صرف ایک سال میں بیس بیس برس سے قائم تمام سیاسی پارٹیوں کو پھلانگتی ہوئی اقتدار پر قابض ہوگئی کیونکہ اس پارٹی کا غریب عوام نے بھرپور ساتھ دیا تھا اور ووٹ دے کر اس کو مسند اقتدار پر پہنچایا تھا۔ پھر عوام اس خوش فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ اب ان کے دن پھر جائیں گے مذکورہ پارٹی کا کہنا یہ تھا کہ امیروں سے کارخانے، زمینداروں سے جاگیریں چھین کر غریبوں میں تقسیم کر دی جائیں گی۔ راتوں رات بڑی بڑی صنعتیں بینک، تعلیمی ادارے، انشورنس کمپنیاں قومیالی گئیں۔ دنیا میں ایک انوکھا اور منفرد تجربہ کیا گیا وہ یہ کہ ملکی ادارے تو قومیائے گئے۔ مگر غیر ملکی اداروں کو ہاتھ بھی نہ لگایا گیا حالانکہ جب بھی کسی ترقی پذیر ملک میں صنعتی انقلاب آیا ہمیشہ غیر ملکی ادارے ہی قومیائے گئے نہ کہ ملکی ادارے کیونکہ ملکی ادارے تو ہوتے ہی ملک کے ہیں۔ مذکورہ حکومت کے اقدام کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام صنعت کار اور سرمایہ دار راتوں رات اپنے اداروں سے محروم ہوگئے۔ ایوب خان کے انقلابی منصوبوں کی وجہ سے ملک ترقی کی طرف بڑھ رہا تھا، یہ ترقی رک گئی۔ سرمایہ داروں نے غیر ممالک جا کر صنعتیں لگالیں اور یہ صنعتی ادارے حکومت کی تحویل میں جا کر نفع دینے کے بجائے آہستہ آہستہ نقصانات دینے لگے اور پھر نقصانات کی حدود کراس کر گئے بالآخر ذوالفقار علی بھٹو کی اصلاحات کے تحت قومیائے گئے یہ ادارے خود ان کی بیٹی محترمہ بے نظیر بھٹو کو واپس ان ہی سرمایہ داروں کے ہاتھوں فروخت کرنے پڑے کیونکہ حکومت کبھی تاجر نہیں بن سکتی۔ غریب عوام کو کچھ نہیں ملا صرف مزدوروں کو مالکوں سے لڑا دیا گیا ایسے لیبر قوانین بنائے جس سے نہ مزدوروں کو فائدہ ہوا اور نہ مالکوں

کو۔ نئی صنعت کاری کا رجحان ختم ہوگیا۔ غریب پھر غریب رہا۔ اس طرح گاؤں، گوٹھوں، دیہاتوں سے ملنے والے ووٹوں سے بھی عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکا کیونکہ جاگیرداروں اور زمینداروں سے زمین چھین کر عوام میں تقسیم کرنا تھی مگر ان جاگیرداروں نے پٹواریوں سے مل ملا کر زمین اپنے رشتہ داروں، عزیزوں، دوستوں اور پرانے ہاریوں کے نام منتقل کروالی۔ چند بڑے بڑے مخالفین کو اس لینڈ ریفارمس سے ڈرا کر خاموش کر دیا گیا جو نہیں مانا اس کی زمین حکومت نے قبضہ میں لے لی چند ہزار ایکڑ بنجر زمین غریب ہاریوں میں تقسیم کر دی گئی۔ پاکستان کا غریب ہاری پھر غریب رہا۔

بینکوں کا اربوں روپیہ غریب عوام کو ملنے کے بجائے بینکوں کے افسران اور حکومت کے سربراہان نے پھر ان ہی سرمایہ کاروں کو قرض دے کر ڈبو دیا۔ یہی تین سو ارب روپے غریبوں کو قرض دے کر ان کی حالت سدھاری جاسکتی تھی۔ مگر ایسا کرنے میں بینک افسروں اور حکومت کے کرتا دھرتاؤں کو بھلا کیا فائدہ پہنچتا؟

آخری اور سب سے کاری وار تعلیمی اداروں کو قومیا کر کیا گیا۔ ایک منصوبے کے تحت ہمارا تعلیمی معیار اتنا پست کر دیا گیا کہ ہم دنیا کو منہ دکھانے کے بھی قابل نہیں رہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں کی ڈگریاں ایک کاغذ کے مانند سمجھی جانے لگیں۔ اس طرح عوام غربت اور جہالت دونوں ہی سے جنگ کرتے رہے۔ انہیں نہ روٹی نصیب ہوگئی نہ پہننے کے لئے ڈھنگ کا کپڑا اور نہ رہنے کے لئے مکان۔ البتہ حکومت کے مخالفین کو بڑی تعداد میں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا جہاں انہیں کھانے کے لئے مفت روٹی، پہننے کے لئے قیدیوں کا لباس اور رہنے کے لئے جیل کی کوٹھری نصیب ہوئی۔ اب ہمارے وزیر خزانہ صاحب نے قوم کے موجودہ نجات دہندہ کا پیغام سنایا ہے کہ چیف ایگزیکٹو محترم جناب پرویز مشرف صاحب 15 دسمبر تک غربت مکاؤ، فارمولا دینا چاہتے ہیں تاکہ غریب، غریب نہ رہے۔ بظاہر یہ ایک احسن اقدام ہوگا مگر وزیر خزانہ صاحب نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ راتوں رات ایسے کیا اقدامات کئے گئے ہیں جس سے پاکستان کی معاشی حالت سدھر گئی ہے ابھی تک بینکوں نے تین سو ارب کے قرضوں سے صرف چھ ارب روپے وصول کئے ہیں دوسری طرف حکومت نے یہ بھی عندیہ دیا ہے کہ پیٹرول، بجلی اور گیس کی قیمتوں میں اضافہ ناگزیر ہو چکا ہے اگر دیکھا جائے تو یہ حکومت بھی پرانی حکومت کے فارمولے یعنی آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی ہدایات پر عمل کر رہی ہے۔ اگر ان بنیادی ضرورتوں کی قیمتوں میں اضافہ کیا گیا تو اس کا اثر غریب عوام پر نہیں تو کیا فرشتوں پر پڑے گا ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ ہم کو فی الحال نجکاری کی بھی ضرورت نہیں ہے تو پیسہ کہاں سے آئے گا؟

تین ہفتوں کے لئے عوام کو خوش کر دیا گیا ہے عوام ایک مرتبہ پھر حکومت سے امیدیں لگا کر بیٹھ گئے ہیں

16 دسمبر کی صبح ان کے لئے خوشخبری کا پیغام لانے والی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حکومت خود کپاس اور گندم کے بحران سے دوچار ہے۔ کیا پاکستان کی سرزمین میں خلیجی ریاستوں کی سطح تک تیل نکل آیا ہے۔ یا پھر کوئی سونے کی کان دریافت ہوگئی ہے خدارا غریب عوام کو ایسا کوئی لولی پاپ دینے کی کوشش نہ کریں۔ غربت ایک دن یا چند ہفتوں میں دور نہیں ہوسکتی۔ اس کے لئے دس بیس سال درکار ہوتے ہیں۔ بنجر زمینیں سیراب کی جاتی ہیں نئے نئے کارخانے لگائے جاتے ہیں جاپان اور جرمنی کی طرح دن رات محنت کی جاتی ہے پہلے خود حکومت کو سادگی اپنانا پڑتی ہے بڑے بڑے صدارتی محلوں سے نکل کر عوام کی بستیوں میں رہنا پڑتا ہے پھر جا کر عوام قربانی کے لئے تیار ہوتے ہیں۔

میں نے پچھلے کالم میں لکھا تھا کہ غربت دور کرنے کے لئے سب سے پہلے غریبوں کو بے روزگاری الاؤنس دیا جائے۔ بڑے بڑے محلوں کو فروخت کیا جائے۔ اسلام آباد کا آدھا حصہ ابھی تک غیر ضروری باغوں اور پارکوں سے گھرا بیکار پڑا ہے ان قیمتی پلاٹوں کو دیار غیر میں رہنے والے پاکستانیوں کو فروخت کر کے اربوں روپے ہم ڈالر کی شکل میں وصول کر سکتے ہیں۔ اور ان ہی پاکستانیوں کو سرمایہ کاری کی ترغیب دیں کیونکہ ان کی ذہانت سے غیر ملکی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اسلامی ممالک سے اپیل کریں کہ وہ لیبر صرف پاکستان سے منگوائیں۔ جب ہمارے لاکھوں مزدور باہر جائیں گے تب ڈالروں کی بارش ہوگی۔ جیسا کہ جرمنی میں دوسری بڑی قوم ترکوں کی ہے سب سے زیادہ لیبر بھی ترک قوم سے تعلق رکھتی ہے اسی وجہ سے ترکی جو ہم سے بہت پیچھے تھا آج یورپ کا مقابلہ کر رہا ہے وہاں سے غربت ختم ہو چکی ہے اگر ہم نے واقعی غربت ختم کرنی ہے تو ہم کو انقلابی اقدامات کرنے ہوں گے۔ اگر ہم نے اپنی توانائیاں صرف اور صرف اپنے مخالفین کو ختم کرنے میں ضائع کر دیں تو معاف کیجئے گا' غربت ختم نہیں ہوگی ہماری توانائیاں ختم ہو جائیں گی اور باون (52) سال سے یہی کچھ ہو رہا ہے۔

تیرے وعدوں پہ کہاں تک میرا دل فریب کھائے
کوئی ایسا کر بہانہ' میری آس ٹوٹ جائے

اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے

گزشتہ ہفتے محترم ارشاد احمد حقانی صاحب نے ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا تھا جس کا مفہوم یہ نکلتا تھا کہ سابق وزیراعظم میاں نواز شریف کو اگر پھانسی کی سزا سنائی جائے تب بھی ان کو پھانسی نہیں ہونی چاہئے۔ اس کالم لکھنے کے چند دن بعد انہوں نے پھر لکھا کہ اس کالم کا ردعمل 100 فیصد منفی ہوا ہے اور ان کے قارئین نے جتنے بھی خطوط لکھے ہیں ان میں اس سزا کو برقرار رکھنے کے لئے زور دیا گیا ہے یعنی اگر نواز شریف کو عدالت پھانسی کی سزا سنائے تو ان کو پھانسی ہی ہونی چاہئے اور قارئین نے مشہور حدیث کا بھی حوالہ دیا جس کے مطابق ایک مالدار عورت کو دی گئی چوری کی سزا معاف کرنے کی درخواست کی گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا'' خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی اس جرم کی مرتکب ہوتی تو میں اس کو بھی یہی سزا دیتا'' اور ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ پچھلی قومیں اسی وجہ سے عذاب الٰہی کا شکار ہوئیں اور ختم ہوگئیں کیونکہ وہ امیروں سے متعلق الگ فیصلے کرتی تھیں اور غریبوں کے لئے الگ۔ یہ تمام باتیں خود جناب حقانی صاحب نے اپنے کالم میں لکھتے ہوئے پھر کہا کہ باوجود اکثریت کے اختلاف رائے کے میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ میرا فیصلہ درست ہے۔ یعنی میاں نواز شریف کو پھانسی نہیں ہونی چاہئے۔

محترم ارشاد احمد حقانی صاحب کا کالم شروع ہی سے پڑھتا رہا ہوں مگر نہایت معذرت کے ساتھ پہلی مرتبہ ان کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے یہ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ حقانی صاحب کا اپنے فیصلہ پر اصرار نہ صرف ہٹ دھرمی پر منحصر ہے بلکہ توہین عدالت اور عوام کی رائے کا احترام نہ کرنے کے مترادف ہے' یہ تو وہی بات ہوئی کہ ایک خاتون ریڈیو پاکستان سے وعظ فرما رہی تھیں کہ حضرت عائشہؓ کی آواز کسی غیر محرم نے نہیں سنی تھی' یعنی حضرت عائشہ کی مثال کے برعکس وہ خود اپنی آواز پورے پاکستان کو سنا رہی تھیں۔ مجھ ناچیز کی رائے بھی پاکستان کے عوام کی رائے کے خلاف نہیں' یعنی اگر عدالتیں بااختیار اور صحیح نہیں تھیں تو سابق وزیراعظم نے

کیوں بنائیں اور انہی عدالتوں سے بہت سے لوگ سزا پا کر دوسری دنیا میں چلے گئے۔ کیا وہ غلط فیصلے تھے جس کی وہ بھینٹ چڑھ گئے۔ اگر وہ معصوم تھے تو ان کا خون بھی ان عدالتوں کو بنانے والوں کے سر ہے اور یہ پھندا بھی سابقہ وزیراعظم کے حملے میں فٹ آتا ہے کیونکہ انہوں نے نہ صرف انسداد دہشت گردی کی عدالتیں بنائیں بلکہ ان کے فیصلوں کو سراہا بھی تھا۔ اب جب یہ معاملہ خود ان کے ساتھ پیش آیا تو واویلا کیسا؟ اس پر ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے۔

ملا نصیرالدین کا پڑوسی ان کے گھر آیا اور کہنے لگا کہ حضرت آپ کے بکرے نے میری بکری کو سینگیں مار مار کر ہلاک کر دیا ہے۔ بتائیں میں کیا کروں۔ ملا نصیرالدین نے کہا کہ ''بھئی یہ تو دو جانوروں کا معاملہ ہے۔ میں اس میں کیا کر سکتا ہوں'' وہ پڑوسی بولا ''دراصل میں یہی بتانے آیا تھا کہ میرے بکرے نے آپ کی بکری کو سینگیں مار مار کر ہلاک کر دیا ہے'' اس پر ملا نے اس کو پکڑ لیا اور کہا ''ٹھہرو! میں ابھی قانون کی کتابوں میں دیکھتا ہوں کہ اس کی کیا سزا ہے'' یعنی جب معاملہ آپ کے خلاف ہو تو دوسری نگاہ سے کیوں دیکھا جائے اور حقانی صاحب کا پھر بھی اصرار کہ پنچوں کی بات سر آنکھوں پر مگر پرنالہ وہیں گرے گا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ عدالتیں جو بھی فیصلہ کریں ان کو شفافی اور صفائی کا پورا موقع دینے کے بعد کریں۔ کسی بھی فریق کے ساتھ زیادتی نہیں ہونی چاہئے۔ انصاف کے تمام بین الاقوامی تقاضے پورے ہونے چاہئیں۔ کسی بھی طرح کی جانبداری یا انتقامی کارروائی نہیں ہونی چاہئے اور دنیا کو ہنسنے کا موقع نہیں دینا چاہئے۔ اگر الزام ثابت ہو جائے تب سزا کے مستحق کسی بھی فرد کو معافی نہیں ملنی چاہئے۔ پھر صرف دہشت گردی کی عدالتوں کے فیصلے پر ہی تو پھانسی نہیں ہو جاتی۔ اس سے بڑی عدالتیں بھی موجود ہیں۔ میری دیانتدارانہ سوچ یہ ہے کہ یہ اللہ کی پکڑ ہے جو ہر منہ زور پر ایک نہ ایک دن آتی ہے۔ نواز شریف صاحب نے جس دن ایک جلسہ عام میں فرمایا تھا کہ ''نواز شریف کو کوئی نہیں ہٹا سکتا'' میں نے اسی دن سمجھ لیا تھا کہ نواز شریف صاحب کے دن گنے جا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود نواز شریف کے منہ سے یہ کلمہ کہلوا دیا کیونکہ باقی رہنے والی ذات صرف اور صرف اللہ ہے۔ تکبر بھی صرف اللہ کے لئے ہے اور جو اللہ کی برابری کرتا ہے اس کا انجام عبرت ناک ہوتا ہے۔ یہاں میں دو باتوں کا ذکر بھی کرنا چاہوں گا۔ پہلی بات یہ کہ بار بار بھاری مینڈیٹ کا حوالہ دیا جاتا ہے جو سراسر غلط ہے گزشتہ انتخابات میں صرف 26 فیصد عوام نے ووٹ ڈالے جس میں 14 فیصد میاں نواز شریف کو ووٹ پڑے۔ بقایا 12 فیصد دوسری تمام پارٹیوں کو ملے۔ اس طرح نواز شریف جیت گئے۔ یہ ہمارے طریقہ انتخابات کے حوالے سے تو اکثریت تھی مگر 74 فیصد عوام نے تو ووٹ ہی نہیں ڈالے اور 12 فیصد نے خلاف ووٹ ڈالے۔ گویا 86 فیصد

لوگوں نے نواز شریف کو نہیں چنا تو درحقیقت عوام نے تو انہیں رد کر دیا۔ مگر انگریزی نظام نے ان کو چن لیا۔ اسی وجہ سے جب ان کو ہٹایا گیا تو عوام نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا کیونکہ وہ ان کے اصلی نمائندے تھے ہی نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 74 فیصد عوام نے کیوں ووٹ نہیں ڈالا تو اس کا جواب یہ ہے کہ میدان سیاست میں دو بڑی پارٹیاں نمایاں تھیں اور عوام کی نگاہ میں دونوں ہی کرپٹ ثابت ہو چکی تھیں۔ لہٰذا عوام ووٹ ڈالنے کے بجائے گھر میں بیٹھے رہے یعنی دونوں کو ٹھکرا دیا۔ مگر اس کا مطلب الٹا لیا گیا کہ عوام نے انہیں بھاری مینڈیٹ دیا ہے اسی ''مینڈیٹ'' کی اکڑ میں حکمران بے لگام ہو گئے۔ پہلے صدر کے اختیارات چھینے پھر عدلیہ کے ساتھ مذاق اور چھیڑ چھاڑ شروع کی اور چیف جسٹس کو فارغ کر دیا جس کے بعد صدر صاحب سے دو دو ہاتھ کئے اور ان کو رخصت کر دیا جب اس سے فارغ ہوئے تو فوج کے دو جرنیلوں کو بھی اسی طرح رخصت کر دیا گیا۔ کوئی ردعمل نہیں ہوا تو سوچا یہ آخری کانٹا بھی ہٹا دوں تا کہ پھر ''امیر المومنین'' بننے میں کوئی رکاوٹ نہ رہے۔ چنانچہ جب جنرل صاحب کا جہاز ہوا میں بلند ہوا تو یہ وار آزمایا گیا مگر افسوس یہ وار بے لگام حکمرانوں پر الٹ گیا اور اب الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے۔ مجھے اس موقع پر ایک اور لطیفہ یاد آ رہا ہے۔ ایک بریگیڈیئر صاحب کا بے لگام گھوڑا تھا۔ جب بھی کھلتا کبھی کسی سپاہی کے دولتی جھاڑ دیتا۔ کبھی کسی کیپٹن کو، کبھی کسی میجر کو سب خاموش رہتے کہ بریگیڈیئر صاحب کا گھوڑا ہے۔ آخر اس کی منہ زوری زیادہ بڑھی تو ایک دن اس نے ایک بم کو لات ماردی۔ انجام ظاہر ایسی ہی اٹھکھیلیں سابق حکمران بھی کر رہے تھے تو جو ہوا وہ تو ہونا ہی تھا۔ اب اس پر بحث مباحثے کے بجائے انتظار کرنا چاہئے اور دعا کرنی چاہئے کہ اللہ جو کرے پاکستان کے لئے بہتر کرے کیونکہ جو آج بوئے گا وہی کل کاٹے گا۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔

ایک ڈاکٹر مہاتر محمد کا انتظار ہے

رمضان المبارک سے چند روز قبل دبئی جانے کا اتفاق ہوا کیونکہ میری پہلی کتاب ''شگوفہ نو'' کی 7 دسمبر کو رونمائی کی تقریب چند وجوہات کی بناء پر ملتوی ہوگئی تھی جو انشاء اللہ بعد رمضان منعقد ہوگی۔ کراچی ایئرپورٹ پر پہنچا تو امیگریشن کے کاؤنٹر پر لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں جو اس سے قبل دیکھنے میں نہیں آتی تھیں۔ غیر ملکی مسافروں کے کاؤنٹر پر کوئی بھی نہیں تھا۔ فلائٹس لیٹ کی جارہی تھیں حالانکہ اس وقت صرف دو فلائٹس جانے والی تھیں پوچھنے پر معلوم ہوا کہ نادہندگان کے باہر جانے پر پابندی کی وجہ سے ہر مسافر کو نادہندگان کی فہرستیں چیک کر کے ہی اسٹیمپ کیا جارہا ہے۔ اس لئے ہر مسافر پر دس منٹ خرچ ہورہے ہیں۔ ہر کاؤنٹر پر دو دو ایف آئی اے کے افسران بیٹھے ہیں۔ ایک لسٹ چیک کرتا ہے دوسرا مسافر کا منہ دیکھتا رہتا ہے لسٹ چیک کرنے والا منہ دیکھنے والے افسر کو کہتا ہے ''ٹھیک ہے اسے جانے دو'' تب وہ افسر پاسپورٹ پر اسٹیمپ لگاتا ہے۔ خواتین، بچے، بوڑھے سب ہی لائنوں میں لگے نادہندگان کو اور ایف آئی اے کے عملے کو برا بھلا کہہ رہے تھے میں نے ایف آئی اے کے ایک بڑے افسر سے کہا کہ جب رش زیادہ ہے اور مسافر بھی پریشان ہیں تو آپ کاؤنٹر کیوں نہیں بڑھاتے اور دونوں غیر ملکی کاؤنٹر پر جو افسران بیکار بیٹھے ہیں۔ ان سے کام لیا جاسکتا ہے۔ جبکہ وزیر داخلہ جناب معین الدین حیدر صاحب نے آج ہی بیان دیا ہے کہ ایئرپورٹ پر ناجائز تنگ نہیں کیا جائے گا مگر یہاں ایک گھنٹہ ہوگیا ہے اور میرا نمبر نہیں آرہا ہے۔ فلائیٹ میں صرف پندرہ منٹ رہ گئے ہیں۔ اس افسر نے کہا کہ ہمارے پاس اسٹاف کم ہے ہم کچھ نہیں کرسکتے کچھ مسافروں نے بھی میرا ساتھ دیا اور کافی شور مچایا یہاں تک کہ ایئرلائن کے ملازمین بھی اپنی فلائیٹ کے لیٹ ہونے کا رونا رو رہے تھے تب کہیں جا کر ان موصوف نے غیر ملکی کاؤنٹر پر پاکستانی مسافروں کو اسٹیمپ کے لئے لائن لگانے کا حکم صادر فرمایا جس کے بعد مسافروں کا رش کم ہوا پھر بھی دو کاؤنٹر خالی پڑے رہے۔ اسٹیمپ ہونے کے بعد میں کاؤنٹر سے آگے بڑھا

تو ایک اور ایف آئی اے کا افسر میرے پاس آیا اور میرا پاسپورٹ چیک کرنے لگا پوچھا کہ دوبئی کیوں جارہے ہو۔ میں نے کہا کہ ہم کاسمیٹک ایکسپورٹ کرتے ہیں۔ اپنی کمپنی کا نام بتایا تو مذکورہ افسر اپنے ماتحت سے کہنے لگا۔ ان کا نام تم نے غور سے چیک کرلیا ہے اتنی بڑی کمپنی کے مالک ہونے کے باوجود ان کا نام نہ ای سی ایل (ECL) میں سے نہ ڈیفالٹر لسٹ میں؟ میں نے بتایا کہ ہم بینک سے قرض ہی نہیں لیتے تو کیوں ہمارا نام ہوگا۔ اس کو یقین نہیں آیا۔ دوبارہ چیک کرنے کے بعد مجھے جانے کی اجازت دی۔ اس دن میں نے دیکھا جب کوئی مزدور کاؤنٹر پر آتا تھا تو ایف آئی اے والا جھٹ اسٹمپ لگا دیتا تھا۔ جب کوئی خوش پوش آتا تھا تو پہلے نیچے سے اوپر تک دیکھتا پھر سوالات کی بوچھاڑ کرتا پھر اپنے ماتحت سے کہتا کہ بھئی ان کا نام لسٹ سے چیک کر کے بتاؤ۔ اس دوسرے مرحلے سے گزر کر ہم نے جیسے ہی کاؤنٹر پار کیا تو ایک نوجوان فوجی نے جو شیشے کے پیچھے کھڑا تھا مجھ سے اخلاق سے پاسپورٹ طلب کیا پوچھا! آپ کیا کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ میں نے بتایا کہ ہماری کمپنی پاکستان کے لئے ڈالر کما کر لاتی ہے۔ ہمارا مال غیر ممالک میں بھی مقبول ہے۔ بہرحال اس نوجوان نے بڑے اخلاق سے جانے کو کہا۔ میرے لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا بھر میں ایئرپورٹوں پر ایگزٹ کنٹرول لسٹیں کمپیوٹر میں فیڈ ہوتی ہیں۔ وہ ایک سیکنڈ میں مسافر کا نام اس سے چیک کر لیتے ہیں مگر ہم آج بھی دقیانوسی طریقہ کار اپنائے ہوئے ہیں اور معصوم مسافروں کو جن میں بچے، بوڑھے، عورتیں اور مزدور شامل ہیں۔ گھنٹوں قطار میں لگائے ان کو ہراساں کرنے سے باز نہیں آتے۔ اس سارے عمل سے موجودہ حکومت کی بدنامی کا احتمال ہے۔ وزیر داخلہ صاحب کے واضح احکامات کا مذاق اڑایا جارہا ہے حکام کو چاہئے۔ اس کی روک تھام کے لئے انسپکشن ٹیمیں بنائیں اور تمام ایئرپورٹ پر اس بات کا خیال رکھیں کہ کسی بھی مسافر کو ہراساں نہ کیا جائے اور نہ ہی اتنی لمبی لمبی قطاریں لگیں۔

میں نے اس سے پہلے بھی لکھا تھا کہ برسوں پرانے قرضے اتنی آسانی سے وصول نہیں ہوسکتے۔ اس کے لئے وقت درکار ہوتا ہے اس میں قرض لینے والا اکیلا ملوث نہیں ہے۔ یہ بینکر بھی اسی طرح ملوث ہیں۔ قرض لیتے وقت کمیشن دینا پڑتا تھا پھر اوپر سے آرڈر آتا تھا وہاں بھی کمیشن دیا جاتا تھا تب جا کر یہ قرضہ معاف ہوتا تھا۔ اس میں کچھ اصلی کیس بھی ہوتے تھے۔ واقعی صنعتیں بند ہوجانے کی وجہ سے ڈیفالٹ ہوجاتے تھے۔ اس میں بھی کئی کئی گنا سود وصول کرنے کے باوجود اصلی رقمیں باقی رہتی تھیں۔ یہ دیکھئے کہ 300 ارب روپے ڈوبنے کے باوجود آج تک ایک بینک بھی بند نہیں ہوا۔ البتہ سینکڑوں فیکٹریاں سود ادا کرتے کرتے بند ہوگئیں۔ اور اسی وجہ سے لاکھوں مزدور بے روزگار ہوگئے ہیں اب صرف صنعتی انقلاب لانا پڑے گا جیسا کہ

ہمارے برادر مسلمان ملک ملائیشیا میں جناب ڈاکٹر مہاتر محمد اٹھارہ سال قبل لائے تھے۔ آج ملائیشیا کا شمار چند بڑے کامیاب صنعتی ملکوں میں ہوتا ہے۔ جہاں 18 سال پہلے غربت تھی اور معمولی صنعت کاری ہوتی تھی آج دنیا کا کون سا بڑا پلانٹ ہے جو وہاں نہیں لگا ہوا اور ساتھ ساتھ حکومت پر کوئی کرپشن کا الزام نہیں ہے۔ ملائیشین قوم نے جناب مہاتر محمد کو پانچویں بار دو تہائی اکثریت سے پانچ سال کے لئے پھر چن لیا ہے۔ جناب چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف صاحب! ایک ایکسپرٹ ایماندار افراد پر مشتمل ٹیم ملائیشیا بھیجئے اور وہ تمام اقدامات جو 18 سال قبل مہاتر محمد کی سربراہی میں صنعتی انقلاب لانے کے لئے کئے گئے تھے وہ سب کے سب پاکستان میں نافذ کر دیجئے پھر امید کیجئے گا کہ پاکستان بھی ایشین ٹائیگر بن جائے گا۔ فی الحال تو وہ ایشین بلی بھی نہیں بن سکا۔ کرپشن اس کی بنیادوں سے جب تک نہیں نکالا جاتا اس وقت تک آپ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ غیر معمولی اختیارات اور صوابدیدی اختیارات کے ساتھ بے پناہ ٹیکسوں کی بھرمار ہماری معیشت کو کھوکھلا کر چکی ہے۔ اب اس کو ختم کئے بغیر ہماری معیشت نہیں پنپ سکتی۔ انڈونیشیا نے کرپشن کی آڑ میں ترقی کی۔ ان کی معیشت 33 سالہ صدر سوہارتو اینڈ سنز کے ہاتھوں راتوں رات بیٹھ گئی۔ ملائیشیا واحد مسلمان جمہوری ملک ہے جس کے سربراہ کو جمہوری طریقہ سے پانچ مرتبہ چنا گیا اور آج بھی ان کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی اور نہ ہی ان پر کرپشن کا کوئی الزام لگا۔ کاش آپ ہی مہاتر محمد کی کمی پوری کر دیں!

عوامی چارج شیٹ اور زرعی اصلاحات کی فوری ضرورت

پچھلے ہفتے میں نے صنعتی انقلاب کی ضرورت پر زور دیا تھا کہ جب تک ہم اپنی پیداوار میں خود کفیل نہیں ہوں گے۔ اس وقت تک ہم دنیا کے آگے کشکول لئے پھرتے رہیں گے۔ کبھی ہم امریکہ کی غلامی کریں گے تو کبھی ورلڈ بینک سے قرضوں کی ری شیڈولنگ کروا کر خوشی کے شادیانے بجائیں گے۔ حتیٰ کہ ہم نے اپنی قومی شناخت بھی آئی ایم ایف کے پاس گروی رکھ دی ہے۔ وہ جب چاہتے ہیں ہم سے بجلی، گیس، پانی کے نرخ بڑھوا کر ہمارے غریب عوام کو مہنگائی کے بوجھ تلے اور دوفٹ دبا دیتے ہیں تاکہ کسی بھی طرح ہم اپنے قرضے نہ اتار سکیں اور نہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔

گزشتہ پچاس برس سے ہم مختلف نعروں، وعدوں، اسکیموں کے نام پر فریب کھا رہے ہیں۔ کبھی روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگا۔ پھر اس کو بھگانے کے لئے نظام مصطفیٰ کا جھنڈا بلند کر کے ایجی ٹیشن ہوا جس کے نتیجے میں پھر مارشل لاء لگا اور اسلام اسلام کی رٹ لگا کر جمہوریت کا گلا گھونٹا گیا۔ اللہ اللہ کر کے سی ون تھرٹی (C1-30) نے آمریت سے جان چھڑائی اور جمہوریت پھر ملک میں لائی گئی تو حزب اقتدار اور حزب اختلاف ایک دوسرے سے لڑتے اور اپنی اپنی جیبیں بھرتے گئے۔ اربوں روپے کی ٹریکٹر اسکیموں پر کمیشن وصول کر کے عوام کو بیوقوف بنایا پھر ٹیکسی کی یلو کیب اسکیم کے نام پر مرسڈیز گاڑیاں تک امپورٹ ڈیوٹی کے بغیر منگوا کر نہ صرف کمیشن وصول کیا گیا بلکہ ملک کو بھی بھاری ڈیوٹی سے محروم کر دیا گیا۔ عوام کو پھر بھی کچھ نہیں ملا پھر اربوں روپے کی لاگت سے بیکار اور بے مصرف موٹروے بنا کر کمیشن لیا گیا بلکہ اپنی اپنی زمینوں سے سڑک گزار کر بنجر زمین کی منہ مانگی قیمت حکومت پاکستان سے حکمرانوں نے وصول کی۔

دوسری طرف ایک ایک ہفتے کے لئے ڈیوٹی ختم کر کے اور دوبارہ آئی ٹی پی کم کر کے خود ان حکمرانوں نے اربوں کے گھپلے کئے۔ پھر ایٹمی دھماکے کی آڑ میں ڈالر اکاؤنٹ منجمد کر دیئے اور اس طرح خود اپنے اپنوں نے

راتوں رات ڈالر بیرون ملک منتقل کر کے غریب عوام کو ان کی دولت سے محروم کر دیا پھر ''قرض اتارو ملک سنوارو'' کے نام پر قوم نے چندہ دیا جس کا آج تک کوئی حساب سامنے نہیں آیا کہ کتنا قرضہ آیا اور کہاں گیا۔ بینکوں سے بغیر کسی کارنٹی کے تینوں حکومتوں (جونیجو' بے نظیر اور نواز شریف) نے دل کھول کر قرضے دلوائے اور پھر معاف کروائے۔ تازہ فراڈ ''اپنا گھر'' کے نام پر قوم کو لوٹنے کی تیاری جاری تھی کہ حکومت کا تختہ الٹ گیا۔ کل کے لٹیرے پھر مظلوم بن گئے اور اپنی اپنی بے گناہی کا راگ الاپنے لگے حتیٰ کہ خواتین بھی میدان میں اتار دی گئیں۔ کل تک دوسروں کی ماں' بیٹی اور بہنوں پر ظلم و تشدد کر کے خوش ہونے والے سیاسی گرو آج خود مگر مچھ کے آنسو بہا رہے ہیں۔ مگر عوام کل بھی غریب تھے آج بھی غریب ہیں۔

موجودہ چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف صاحب نے بھی ایک پیکج 6 ارب روپے کا دیا ہے۔ میں نے پہلے بھی وضاحت سے لکھا تھا۔ آج پھر لکھ رہا ہوں کہ پیکج ایسا دیجئے جو دے کر واپس نہ لیا جائے اور عوام کی حالت سدھر سکے۔ صنعتی انقلاب کے ساتھ زرعی انقلاب بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ ہمیں چاہئے کہ سب سے پہلے کراچی سے تھرتک کی بنجر زمینیں سیراب کریں۔ جو ایک رات یا ایک سال میں تو یقیناً ممکن نہیں مگر ناممکن ہرگز نہیں ہے۔ اس کے لئے ہمیں سب سے پہلے کراچی اور گوادر سومیانی بیچ پر سمندری پانی کو میٹھا بنانے کے پلانٹ لگانے چاہئیں۔ دوسری تمام اسکیمیں جو غیر ضروری ہیں ان کو فوری طور پر ختم کر کے تمام توجہ اور قوت ان پلانٹوں پر لگانے سے صرف چند سال بعد پنجاب اور سرحد کی طرح سندھ اور بلوچستان کی کروڑوں ایکڑ زمینیں سیراب ہونے لگیں گی کیونکہ یہ پلانٹ سمندر کے پانی کو نہ صرف میٹھا کرتے ہیں بلکہ ہم ان سے جتنی چاہیں بجلی پیدا کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ان پلانٹوں کی تنصیب سے ملک میں بجلی کی قلت نہیں رہے گی۔ پانی کی فراہمی کا مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا اور اس سمندری پانی سے نمک اور دیگر معدنیات بھی حاصل ہوں گی جس میں کاپر میگنیشیم وغیرہ شامل ہیں۔ ماضی کی حکومت نے اس پر صرف کاغذوں کی حد تک کام کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم گندم اور چینی امپورٹ کرتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی دالیں' مرچیں' پیاز' ٹماٹر تک امپورٹ کرنا پڑتے ہیں۔ اگر اس قسم کے پلانٹ کی منصوبہ بندی آج سے شروع کر دی گئی تو نہ صرف بنجر زمینوں سے نجات ملے گی بلکہ ہم بھی خلیجی ملکوں سعودی عرب' کویت' متحدہ عرب امارات کی طرح' جہاں آج سے بیس سال پہلے تک ایک تنکا نہیں اگتا تھا۔ آج نہ صرف خود کفیل ہو چکے ہیں۔ بلکہ برآمد بھی کر رہے ہیں۔ اس طرح بے روزگاری بھی ختم ہو گی اور ان کھیتوں اور درختوں کی وجہ سے بارشیں بھی ہونے لگیں گی اور آج کے تپتے ہوئے صحرا کل مہکتے ہوئے گلستان بن جائیں گے۔ کیونکہ ہریالی اور درخت خود بارش کے اسباب پیدا کرتے ہیں' اس سے نہ صرف

ہمیں اپنی ضرورت کے لئے میٹھا پانی' بجلی' معدنیات' اناج' سبزیاں اور لکڑی حاصل ہو گی بلکہ اضافی پیداوار کر کے اگلے دس سال میں ایک خوشحال پاکستان بنا سکتے ہیں۔

آخر میں ایک بات یہ کہ موجودہ حکومت نے بیرون ملک سے ڈالر پر جو چھوٹ ختم کی ہے اس کی رو سے ان سے یہ نہیں پوچھا جاتا تھا کہ ڈالر کہاں سے آیا اس پر چھ سال کی دولت ٹیکس سے بھی مستثنیٰ اسکیمیں ختم کر کے نہ صرف خود پاکستان کو مزید بیرونی امداد پر انحصار کرنا پڑے گا بلکہ غیر قانونی ہنڈیوں کی بدولت بیرون ملک پاکستانی اپنی رقم سے بھی ہاتھ دھو سکتا ہے' جیسا کہ پہلے ہوتا تھا کیونکہ بینک غیر ملکی ڈالر 51 روپے میں لیتے ہیں جبکہ ملک میں ڈالر کھلی منڈی میں 55 روپے تک ملتا ہے گویا چار روپے فی ڈالر بھیجنے والے کو نقصان ہو گا جو دس فیصد ہو گا۔ پوری دنیا میں لوگ ڈالر لانے والوں کو معاوضہ کے علاوہ شہریت تک دینے پر آمادہ ہیں' کجا ہم ڈالر لانے والوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس اسکیم کو دوبارہ جاری کر دینا چاہئے۔ یہ کسی کی شرارت بھی ہو سکتی ہے' موجودہ حکومت کو ناکام بنانے کی ایسی سازشوں کا فوری سدباب کر دینا ہی بہتر ہے۔

ہائی جیکنگ نے بھارت کو بے نقاب اور طالبان اور پاکستان کو سرخرو کر دیا

ایئر انڈیا کے جہاز کا نیپال سے ڈرامائی اغواء اگرچہ اس کے منطقی انجام تک پہنچ چکا ہے مگر اغواء شدہ طیارے کے مسافروں کی رہائی کے بعد سے ہندوستانی حکمرانوں کا لب ولہجہ انتہائی جارحانہ ہوگیا ہے۔ وزیراعظم واجپائی روز ایک نئی کہانی کے ساتھ اپنی کابینہ اخبارات اور اپوزیشن کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اغواء میں پاکستان ملوث ہے اور ہائی جیکروں کا تعلق بھی پاکستان سے ہے اور تو اور وزیر دفاع اور وزیر خارجہ کے علاوہ ہر وزیر اپنی اپنی راگنی الاپ رہا ہے کوئی طالبان کو ملوث کر رہا ہے تو کوئی تمام مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے۔ طالبان کے وزراء سے متعلق مختلف بیانات بھی جاری کئے جا رہے ہیں۔ افغانستان کے وزراء ان بیانات سے عاجز آ کر تردید کر چکے ہیں مگر بی جے پی روز نت نئے بیانات ان سے منسوب کرنے سے باز نہیں آتی۔ اگرچہ ہماری حکومت نے اس مرتبہ بڑی مستعدی سے بھارتی پروپیگنڈے کا توڑ کیا مگر بھارت پاکستان کو دہشت گرد ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اور اس کے لئے جس قدر جھوٹ بولا جا سکتا ہے' بول رہا ہے یہ اس کی کوئی نئی عادت نہیں ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا اگر خدانخواستہ پاکستان کو دہشت گرد قرار دے دیا تو پھر بھارت ایک دہشت گرد پڑوسی کے ساتھ کس طرح سکون سے رہ سکے گا! اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود وہ نہ تو اپنے عوام کو مطمئن کر سکا ہے اور نہ ہی اپوزیشن کو یہ سمجھا سکا ہے کہ اس نے امرتسر سے جہاز کو اڑنے کی اجازت کیوں دی اور حکومت پاکستان سے لاہور میں اتارنے کی درخواست کیوں کی؟ اگر پاکستان دہشت گردی میں ملوث تھا تو پھر کیا بھارتی حکمرانوں نے جہاز سمیت اپنے باشندوں کو ایک دہشت گرد ملک کے حوالے کرنے کا سنگین جرم نہیں کیا؟ حکومت پاکستان نے کامیابی کے ساتھ جہاز کو لاہور میں اتار کر اور پیٹرول فراہم کر کے واپس روانہ کرنے سے تمام بھارتی چالوں کو ناکام بنا دیا اور اب بھارتی حکمرانوں کے پاس سوائے الزام تراشی کے کچھ نہیں رہا۔

اگر ہم اس واقعہ کی تفصیل میں جائیں تو طالبان اور پاکستان دونوں نے دنیا کو یہ باور کرا دیا کہ نہ پاکستان دہشت گرد ہے اور نہ ہی طالبان وہ ہیں جو ان کو امریکہ اسامہ بن لادن کے حوالے سے پیش کر رہا ہے۔ طالبان

کا کردار عین اسلامی اور مدبرانہ رہا۔ نہ تو انہوں نے ہائی جیکروں کو قتل وخون کرنے دیا اور نہ ہی بھارت کو جارحیت کرنے دی۔ البتہ زی ٹی وی نے پہلے دو دن تک پوری قوم کو غلط اطلاعات اور مفروضوں میں الجھا کر کروڑوں روپے کے اشتہارات حاصل کئے۔ ایک طرف پوری قوم اضطراب کی کیفیت میں مبتلا تھی تو دوسری طرف زی ٹی وی بیہودہ اور لچر اشتہارات دکھا کر روپے بٹورنے میں مصروف تھا یہی زی ٹی وی تھا جس نے پہلے یہ کہا کہ طیارے میں پاکستان کا کوئی باشندہ سوار نہیں ہے مگر کچھ دیر بعد اس نے من گھڑت نام سنانے شروع کر دیئے اور اغواء کے ڈرامے کو پاکستان کے سر تھوپنے کی پوری کوشش کی اور سات دن تک اس ڈرامے میں ستر سے زیادہ کہانیاں گھڑیں اور ان کہانیوں کی آڑ میں نئے نئے لوگوں کو ٹی وی اسٹیشن بلا کر ہاں میں ہاں ملوائی گئی۔ اور بھارتی حکمرانوں کی سنگین غلطیوں پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوششیں کی گئیں مگر عوام کو تادیر بے وقوف نہ بنایا جا سکا۔ حقیقت عوام کی سمجھ میں آئی تو انہوں نے شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا' وزیراعظم اور دہلی ایئرپورٹ کا گھیراؤ کر لیا اور پوچھا کہ پی جے پی کی حکومت دو دن تک نہ طالبان سے مذاکرات کر سکی اور نہ ہی ہائی جیکروں سے کوئی بات چیت شروع کر سکی اس طرح 48 گھنٹے کیوں ضائع کئے اور مسافروں کو کیوں موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا کیا۔ اس تاخیری حربے (DelayedTasties) کی کیا وجہ تھی اور امرتسر سے جہاز کو روانہ کرنے میں کون کون ملوث ہے۔ پھر لکھنو پر سے تو جہاز کو گزرنے دیا اور اترنے کی اجازت نہیں دی جبکہ پاکستانی حکمرانوں سے جہاز کو اتارنے کی درخواست کی جاتی رہی۔ اگر ایک مرتبہ پھر پاکستان 1971ء کی طرح اس ٹریپ میں آ جاتا تو یقیناً بھارت کی یہ کوشش ہوتی کہ کسی طرح اس جہاز کو اڑا دیا جائے کیونکہ اس جہاز میں ''را'' کے ایجنٹ موجود تھے۔ پی آئی اے کے جہاز سے انڈین ایئرلائنز کے جہاز تک مسافروں کی شکل میں ہائی جیکروں کے پہنچنے کی کہانی صرف اور صرف زی ٹی وی کے پروڈیوسروں کی اختراع تھی۔ جس پر بڑی جگ ہنسائی ہوئی۔ خود اپوزیشن نے پاکستان اور طالبان کے موقف سے اتفاق کیا اور واجپائی حکومت پر نااہلی کے الزامات لگائے۔ اس مرتبہ پاکستان ٹیلی ویژن نے بھی بھرپور طریقہ سے بھارتی حکمرانوں اور زی ٹی وی کے جھوٹ سے مسلسل پردے اٹھائے اور بہت موثر طریقے سے تجزیے پیش کر کے خود کو ایک پروفیشنل آزاد ٹی وی ثابت کر کے عوام سے بھی داد وصول کی اور پاکستان کے موقف کو بڑی مہارت سے پیش کرنے پر مبارک باد کے مستحق قرار پائے۔ ہماری حکومت نے جب بھارت کو آئینہ دکھانا شروع کیا تو بھارت نے مزید بوکھلاہٹ کا ثبوت دیا۔ اور ہائی جیکروں کے مطالبات پر کان دھرنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ یہی حکمران ہیں جنہوں نے کشمیر کے مفتی سعید کی بیٹی کے اغواء کے معاملے میں اتنی جلد بازی دکھائی کہ اغواء کنندگان کے

مطالبات 24 گھنٹوں میں تسلیم کر کے ان کی بیٹی کو رہائی دلوائی اغواء کا یہ واقعہ خود ان کے اپنے ملک میں پیش آیا تھا۔ اس طرح انہوں نے اپنے بھگوان کے کئی چہروں کی طرح اپنے قول و فعل کے کئی چہرے دکھا دیئے۔ یعنی طالبان سے مذاکرات میں پہلے ہائی جیکروں کے مطالبات ماننے سے انکار اور پھر سات دن بعد تینوں مجاہدین کو رہا کر کے خود اپنے موقف کی نفی کر دی۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ان مجاہدین میں سے مولانا مسعود اظہر کو تو خود بھارت کی سپریم کورٹ تین ماہ قبل رہائی کا حکم دے چکی تھی۔ بھارتی حکمران اپنی سالہا سال کی کوششوں کے بعد بھی ان کے خلاف دہشت گردی کا کوئی ثبوت کسی بھی عدالت میں نہیں پیش کر سکے تھے۔ انہیں صرف پاسپورٹ کا نیا مقدمہ بنا کر جیل میں ڈال رکھا تھا۔ الغرض اب جبکہ مسافر رہا ہو چکے ہیں بی جے پی اپنی خفت مٹانے کے لئے بین الاقوامی سطح پر پاکستان اور طالبان سے برسرپیکار ہے۔ وہ اپنے عوام کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنے اقتدار کو طول دینا چاہتی ہے۔ بھارتی اپوزیشن کو چاہئے کہ وہ بی جے پی کے پارٹنروں کو یہ باور کرائے کہ حکومت میں ایک جہاز کے اغواء تک سے نمٹنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ وہ صرف کھوکھلے نعروں اور پرفریب کہانیوں سے عوام اور پوری دنیا کو بے وقوف بنانے کی احمقانہ سوچ رکھتی ہے۔ اگر بھارت کے ساتھ کوئی بڑا واقعہ پیش آ گیا تو وہ کیسے اس سے نمٹے گی؟ مگر یہ بات صاف ہے کہ بی جے پی کی حکومت اگر ٹوٹی تو آئندہ انتخابات میں اس کو زبردست دھچکا پہنچے گا۔ بہرحال حکومت پاکستان کو جب تک بی جے پی کی حکومت ہے ہمہ وقت چوکنا رہنا پڑے گا کیونکہ کانگریس بی جے پی سرکار کو اس غفلت برتنے پر معاف کرنے کے لئے تیار نہیں ہے اور عوام بھی اس واقعہ سے ناراض ہیں۔ اس وجہ سے بی جے پی سرکار حکومت پاکستان کو ہر حالت میں ٹارگٹ کرے گی اور اس کے لئے کسی بھی وقت کوئی نیا ڈرامہ رچایا جا سکتا ہے۔

نوے دن کی کہانی

1977ء میں جب جنرل ضیاء الحق نے اقتدار سنبھالا تو قوم سے خطاب کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ وہ ملک میں 90 دن میں الیکشن کروا کر چلے جائیں گے۔ قوم سے وعدہ کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا تھا کہ یہ ایک مسلمان اور فوجی کا وعدہ ہے مگر وہ 90 دن بعد میں سیاسی گرمی کی وجہ سے پھیل کر گیارہ سال ہو گئے۔ اگر ضیاء الحق کے جہاز کو حادثہ پیش نہ آتا تو شاید وہ آج بھی ہمارے حکمران ہوتے۔ مگر موجودہ چیف ایگزیکٹو جناب پرویز مشرف صاحب نے آج تک سیاسی یا بحالی جمہوریت کا کوئی ٹائم ٹیبل نہیں دیا۔ البتہ یہ ضرور کہا ہے کہ وہ حالات کے قابو میں آتے ہی ملک میں سیاسی نظام بحال کر دیں گے اور اس مرتبہ الیکشن میں وہی چہرے سامنے نہیں آ سکیں گے جو ملک کی تقدیر سے کھیلتے رہے ہیں اور نہ ہی کوئی نادہندہ الیکشن میں حصہ لے سکے گا۔

اس وقت صوبائی و قومی اسمبلیاں اور سینٹ معطل ہیں۔ بلدیاتی ادارے پہلے ہی سے معطل تھے۔ عوام مہنگائی کے ہاتھوں پریشان ہیں۔ تاجر حضرات ابھی تک جنرل سیلز ٹیکس کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ خود حکومت سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے یا نہ کرنے کی الجھن میں مبتلا ہے۔ البتہ سیاست دانوں کو فراغت ہے اور وہ گھر بیٹھے محض بیانات جاری کر کے گزارا کر رہے ہیں۔

90 دن گزر جانے کے باوجود عوام کو کوئی خوشخبری نہیں ملی ہے نادہندگان کی کچھ تعداد جیل جا چکی ہے۔ معزول وزیراعظم نواز شریف پر آج تک طیارہ کیس میں فرد جرم عائد نہیں ہو سکی ہے اور ہائی کورٹ کے ایک معزز جج نے اس کی سماعت سے بھی معذرت کر لی ہے پورے ملک پر سیاسی جمود طاری ہے عوام گومگو کی حالت میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں کہ کل کیا ہونے والا ہے بظاہر اسٹاک ایکسچینجوں میں شیئرز کا کاروبار جاری ہے مگر پورے پاکستان کی تاجر برادری زبردست مندی کا شکار ہے کوئی نئی صنعت گزشتہ نوے دن میں

نہیں لگی اور نہ ہی لگتی نظر آ رہی ہے البتہ اخبارات نئی نئی اسکیموں کے اشتہارات سے بھرے پڑے ہیں۔ انعامات کی بھرمار ہے' کوئی بھی چیز انعام کا لالچ دیئے بغیر نہیں بک رہی اور اب تو بات لاکھوں سے بڑھ کر کروڑوں کے انعامات تک پہنچ چکی ہے۔ مگر اس سب کے باوجود مارکیٹوں میں کوئی ہل چل نہیں ہے۔ پیٹرول' گیس اور بجلی کے نہ صرف نرخوں میں اضافہ کر دیا گیا ہے بلکہ راتوں رات خاموشی سے گیس اور بجلی پر تو 18 فیصد جی۔ایس۔ٹی (G.S.T.) بھی نافذ کر دیا گیا ہے گیس والوں نے تو ماہانہ میٹر تک نافذ کر دیا ہے۔ کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں یہی حال ٹیلی فون کے محکمہ کا ہے۔ کبھی سینٹرل ایکسائز نافذ ہوتی ہے تو کبھی جنرل سیلز ٹیکس نافذ ہوتا ہے اندرون ملک سفر اور بیرونی سفر پر سینٹرل ایکسائز ڈیوٹی کا نفاذ دنیا کی واحد مثال جس کا اعزاز پاکستان کو حاصل ہے۔

اشتہارات پر جنرل سیلز ٹیکس اور اس کی آمدنی پر اضافی ٹیکس بھی ہمارے ملک کی پیداوار ہے۔ کبھی آئی ایم ایف کے دباؤ کا رونا رویا جاتا ہے تو کبھی اپنے اخراجات میں عدم توازن کا بہانہ تراشا جاتا ہے۔ عوام سمجھ رہے تھے کہ چلو سیاسی لوگوں سے جان چھوٹی۔ اب فوجی حکومت آ گئی ہے' مہنگائی کم ہوگی' رشوت کا بازار بند ہوگا۔ لوگوں کو سہولتیں ملیں گی جو سیاسی لوگ عوام کو ٹھگ رہے تھے ان سے نجات ملے گی اور کم از کم نئے ٹیکس نہیں لگیں گے مگر 90 دن گزرنے کے باوجود نئے نئے ٹیکس لگ رہے ہیں۔ مہنگائی گھٹنے کے بجائے اسی رفتار سے بڑھ رہی ہے اب تو عوامی نمائندے بھی اس کے خلاف آواز اٹھاتے ڈر رہے ہیں۔ ابتداء میں فوج کے ڈر سے کچھ دن گاڑیوں کی چوری میں کمی ہوئی تھی مگر آہستہ آہستہ چوریوں میں پھر سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ڈکیتیاں بھی کافی کم ہوگئی تھیں۔ مگر حکمرانوں کی نرمی دیکھ کر ڈاکو پھر سرگرم ہو رہے ہیں اور عوام سراپا سوال ہیں کہ معاشرے کی کون اصلاح کرے گا؟ بے روزگاری کا عفریت پورے ملک کو گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ نوجوان بے روزگار پھر رہے ہیں۔ مسلمان ممالک میں بھی ہمارے نوجوانوں کی کھپت نہیں رہی ہے۔ خلیج سے ہمارے مزدور واپس آ رہے ہیں کیونکہ بنگلہ دیش اور سری لنکا ہم سے آدھے داموں لیبر انہیں فراہم کر رہے ہیں اور چونکہ ہمارے اپنے ملک میں صنعتیں نہیں لگ رہی ہیں لہٰذا بے روزگاروں کو کھپانا ایک بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔ ملکی برآمدات کی صورتحال بھی دگرگوں ہے کیونکہ ہمارا ڈالر ہندوستان کی نسبت 25 فیصد مہنگا ہے اور ہمارا مزدور 50 فیصد زیادہ اجرت لیتا ہے۔ اس وجہ سے ہم بین الاقوامی مارکیٹ میں بھارت سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بھارت میں تمام بنیادی صنعتیں لگ چکی ہیں اور بھرپور پیداوار دے رہی ہیں اس کے مقابلے میں ہم نے محض معمولی نوعیت کی صنعتکاری کی ہے اور ضرورت کی ہر چیز درآمد کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہماری امپورٹ'

ایکسپورٹ سے ہمیشہ زیادہ رہتی ہے یہی وجہ ہے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے قرضوں کے تلے دبے ہوئے ہیں جبکہ بھارت کی ایکسپورٹ' امپورٹ سے کئی گنا زیادہ ہے اس پر آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک جیسے سود خوروں کا کوئی دباؤ نہیں ہے اسی وجہ سے وہاں مہنگائی بھی زیادہ نہیں ہے اور حکومت عوام کے تابع ہے اگر پیاز یا آلو کی قیمت میں ایک روپے کا اضافہ ہو جائے تو لوگ سڑکوں پر آ جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں عید کے موقع پر مرغی اور انڈوں کی قیمتوں میں زبردست اضافہ ہوا اور لوگوں نے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیا۔ ناجائز منافع خوروں نے عید گزرنے کے باوجود دام کم نہیں کئے پھر بھی کوئی احتجاج نہیں کر رہا ہے دوکاندار جب چاہتے ہیں جس چیز کے دام بڑھا دیتے ہیں۔ لوگ خاموشی سے خرید لیتے ہیں۔ اور اگر استطاعت نہ ہو تو خریدنا چھوڑ دیتے ہیں۔ دکاندار سے نہیں پوچھتے کہ بھائی کل تک اس کے یہ دام تھے آج یہ دام کیوں ہیں۔ لوگوں کا یہ رویہ سسٹم ان کی مایوسی کا غماز ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ ان کے کہنے سننے کا کوئی اثر دوکاندار پر ہوگا رہی کسی ایسی اتھارٹی کی بات جو دوکاندار کو مناسب قیمتوں پر مال فروخت کرنے کا پابند بنائے، تو ان لوگوں سے تو معاملہ پہلے ہی سیٹ ہوتا ہے چیخ پکار کرتے ہیں تو کرتے رہیں۔ ضرورت ہوگی تو منہ مانگے دام خریدیں گے ورنہ مال حرام کمانے والے گاہکوں کی کیا کمی ہے جو آتے ہیں، مال لیتے ہیں' بڑے نوٹ نکال کر کاؤنٹر پر پھینکتے ہیں' اور اکثر تو بقایا بھی واپس لینا کسر شان سمجھتے ہیں۔

ملکی معیشت تباہ ہو چکی مہنگائی اور بیروزگاری نے عام آدمی کی زندگی عذاب بنا دی ہے نوجوانوں میں خودکشی کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ مگر حکومت اپنے شاہی اخراجات آج بھی کم کرنے کے لئے کوئی منصوبہ بندی نہیں کر رہی ہے۔ اپنے قرضوں کی ری شیڈولنگ کروا کر خوش ہو رہی ہے اور غیر ملکی ساہوکاروں سے امید کر رہی ہے کہ وہ مہنگائی ختم کروا دیں گے۔ قوم نے موجودہ حکمرانوں سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ کر لی ہیں کیونکہ وہ ماضی کی دونوں حکومتوں کو شاہی اخراجات کی وجہ سے اس کا ذمہ دار سمجھتے تھے اور ان کو یہ امید ہو چلی تھی کہ موجودہ حکومت چونکہ کرپشن کو ختم کرنے آئی ہے اس وجہ سے ان کے مسائل اب حل ہو جائیں گے۔ مگر 90 دن گزرنے کے باوجود ان کے مسائل میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ نظام زندگی اسی طرح بے ہنگم چل رہا ہے اسی طرح جائز کاموں کے لئے لوگ دردر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ رشوت کا بازار اسی طرح گرم ہے بغیر رشوت کوئی فائل اپنی جگہ سے نہیں ہلتی بلکہ اب تو فوجیوں کے ڈر سے لوگ زیادہ رشوت طلب کرتے ہیں کیونکہ اگر پکڑے گئے تو سزا لمبی ہو سکتی ہے لہٰذا اس کا مارجن رکھنا ضروری ہو گیا ہے لوگ کہتے ہیں اگر فوجی اقتدار میں بھی کرپشن اسی طرح جاری رہا تو پھر ہم کسی اور سے کیا امید رکھیں۔ لہٰذا حکمرانوں کو چاہئے کہ اس مایوسی کی فضا

کو ختم کریں۔ انسپکشن ٹیموں کی کارکردگی کی رفتار تیز کریں۔ ایک ایک محکمے میں جا کر صورتحال کا جائزہ لیں اور کرپٹ لوگوں کی چھانٹی کریں گھر بیٹھے کوئی کام نہیں ہوتا جس طرح نہروں کی صفائی کے لئے فوجیوں کو میدان میں لایا گیا' اسی طرح معاشرے کی گندگی دور کرنے کے لئے فوجیوں پر مشتمل انسپکشن ٹیمیں تیار کر کے میدان میں اتاری جائیں اور عوام کو بدعنوانوں' چوروں' رشوت خوروں سے نجات دلائی جائے آنے والے 90 دن کم از کم گزرے 90 دن سے بہتر ہونے چاہئیں۔

دو براعظموں کے پڑوسی ملکوں کی کہانی

یورپ کے دو ممالک ایک ہی براعظم میں واقع ہیں اور ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔ ان کا نام انگلستان اور فرانس ہے دونوں کی زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ دونوں کی تہذیب و تمدن، رہنا سہنا، کھانا پینا' سیاسی شعور الغرض کوئی بھی چیز ایک دوسرے سے مماثلت نہیں رکھتی دونوں پڑوسی ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے جانی دشمن سمجھتے جاتے تھے۔ ایک دوسرے کی زبان بولنا تو کجا پڑھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے فرانسیسی انگلش زبان کو بڑی حقارت سے دیکھتے تھے اگر کوئی مسافر فرانس میں انگریزی میں کوئی پتہ پوچھتا تھا تو فرانسیسی اسے نفرت سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ جاتا تھا اور بیچارا مسافر منہ دیکھتا رہ جاتا تھا یہ کوئی صدیوں پرانی بات نہیں ہے صرف دس پندرہ سال پہلے تک کی بات ہے۔ ایک زمانے تک دونوں ملکوں میں بادشاہت تھی۔ فرانس اپنے بادشاہوں سے نجات پا کر جمہوری ملک بن گیا مگر انگلستان میں آج بھی ملکہ کا راج ہے اور ساتھ ساتھ جمہوریت بھی ہے۔ دونوں نے دیگر ممالک پر حکمرانی کی۔ فرانس کی حکمرانی زیادہ تر عربوں کی خلیجی ریاستوں' افریقہ اور فرانس سے متصل سرحدی ممالک تک محدود رہی۔ اسی وجہ سے اپنے آپ کو عظیم حکمران سمجھتے تھے اور انگریزوں سے نفرت کرتے تھے۔ ان کے اپنے ملک میں اور مفتوحہ ممالک میں ٹریفک کا نظام بھی انگریزوں کے برعکس ہوتا تھا۔ ناپ تول کا نظام انگریزوں سے مختلف تھا۔ انگریز اونس، پونڈ، گیلن، میل میں حساب کرتے تھے تو وہ کلوگرام، لیٹر اور کلومیٹر کے نظام سے کام چلاتے تھے یعنی کوئی بھی چیز ان میں مشترک نہیں تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر برتری لے جانے کی کوشش کرتے تھے البتہ انگریزوں کا رویہ فرانسیسوں کے مقابلے میں اس قدر جارحانہ نہیں ہوتا تھا۔ ان کی فتوحات فرانسیسوں سے بہت زیادہ تھیں۔ وہ تقریباً ہر براعظم میں اپنی حکومت کو پھیلا چکے تھے اسی وجہ سے خود کو گریٹ برٹن (Great Britian) کہلواتے تھے۔ اور ان کا دعوی تھا کہ ان کے زیر اقتدار علاقے میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ مگر ان کی دشمنی ہمیشہ مثالی رہی' ہے دونوں

خوشحال تھے۔ پڑھے لکھے صنعتی تجارتی طور پر ترقی یافتہ تھے۔ موسم اور مذہب دونوں کے تقریباً دونوں کے ایک تھے۔ سوائے کیتھولک مذہب یعنی عیسائیت میں کچھ کچھ بادشاہت کا دخل انگریزوں میں آچکا تھا کیونکہ عیسائی مذہب میں طلاق نہیں ہوتی تھی۔ برطانیہ کے قانون میں مطلقہ سے بادشاہ کی شادی کی ممانعت تھی اسی وجہ سے پروٹیسٹنس وجود میں لائے گئے اور چند ترامیم بادشاہ نے کروالیں باقی تمام چیزیں وہی رہیں آہستہ آہستہ یورپ والوں نے دیکھا کہ ایشیا والے ان سے آگے بڑھ رہے ہیں وہاں تعلیم آچکی ہے ان کی تعداد آبادی کے لحاظ سے زیادہ ہے اور وہ خودسر بھی ہوتے جارہے ہیں تو انہوں نے سکیڑنا شروع کردیا اور اپنی اپنی مملکت کو سمیٹنا شروع کردیا۔ جس کی وجہ سے قومیں آزاد ہونے لگیں اور نئے نئے ملک دنیا کے نقشے پر ابھرنے لگے۔ انہی ملکوں میں ایک ملک بھارت بھی تھا جو باون سال پہلے آزاد ہوا۔ اس ملک میں کئی قومیں آباد تھیں جو ایک دوسرے سے محبت کرتی تھیں ان میں مسلمان اور ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد تھی باقی سکھ، عیسائی، یہودی اور پارسی بہت کم تھے اس ہندوستان پر ایک عرصہ تک مسلمان حکمراں رہے دونوں کا مذہب اگرچہ الگ تھا مگر دونوں ایک دوسرے کے ہمیشہ دوست رہے دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے آپس میں بھائیوں کی طرح رہتے تھے دونوں ایک دوسرے کی زبان سمجھتے تھے یعنی اردو زبان۔ پھر کھانا پینا بھی تقریباً ایک جیسا تھا سوائے آپس میں مذہبی ممنوعہ اشیاء کے دونوں ایک جیسا ہی کھاتے تھے غربت بھی دونوں کی عام (Common) تھی۔ اگر کسی کو اردو نہیں آتی اور وہ دوسری زبان بولتا تھا۔ تو بھی نفرت کا کوئی پہلو نہیں تھا ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں شرکت کرتے تھے الغرض ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں بھی شریک تھے ہمارے بزرگ بتاتے ہیں برس ہا برس ایک دوسرے کے پڑوسی ہونے کے ناتے آپس میں کبھی ہندو مسلم فساد نہیں ہوتا تھا اگر کسی نے شرانگیزی کی کوشش کی تو بزرگوں نے آپس میں بیٹھ کر بیچ بچاؤ کرا کے معاملہ ہمیشہ کے لیے طے کرادیا۔

پھر ہندوستان آزاد ہوگیا تو دونوں قومیں آزاد ہوگئیں مگر افسوس شرپسندوں اور مفاد پرستوں کو موقع مل گیا نسلوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے والے راتوں رات ایک دوسرے کے نہ صرف دشمن بلکہ خون کے پیاسے ہوگئے۔ ایک دوسرے کو قتل کر کے اس کے مال پر قابض ہوگئے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے دونوں ایک دوسرے کو دشمن سمجھ کر لڑ رہے ہیں حالانکہ غربت آج بھی دونوں کا عام مسئلہ (Common Problem) ہے، انگریز جاتے جاتے کشمیر کی صورت میں دونوں کے درمیان دانستہ ایسا ناسور چھوڑ گیا جو دونوں کو کبھی ایک دوسرے کے قریب نہیں آنے دے گا۔ بھارت چونکہ طاقتور تھا اور پاکستان بحیثیت نوزائیدہ

ملک بے حد کمزور اس نے کشمیر پر جھگڑا کرنے کے بجائے یو۔این۔او اور اس وقت کے بھارتی حکمرانوں کے وعدوں پر اعتبار کر کے دوبارہ دوستی کا ہاتھ بڑھایا مگر افسوس مغربی ممالک نے ہم کو ایک دوسرے سے کھنچاؤ اور تناؤ میں رکھ کر ہماری ساری اقتصادی ترقی کو جنگ اور دشمنی کی آگ میں جھونک رکھا ہے اور خود دور بیٹھے ہوا دے رہے ہیں۔

گزشتہ باون برسوں میں دونوں طرف کے مالی اور جانی نقصانات کا اندازہ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ کھربوں ڈالر اس دشمنی کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے دوسری طرف وہی ازلی دشمن انگلستان اور فرانس ایک دوسرے کے اتنے قریب آچکے ہیں کہ ان کی کرنسی، پارلیمنٹ، ایکسپورٹ، ایک ہوچکی ہے، فرانس میں اب انگریزی بولنا فخر سمجھا جاتا ہے دونوں ایک دوسرے سے کھل کر تجارت کررہے ہیں اور یورپ پھر سے ایشیاء کو من مانے داموں پر ٹیکنالوجی بیچ رہا ہے اور ہم اپنے ازلی دشمن کو آج بھی نہیں پہچان سکے ہیں۔ انہوں نے اپنی مفتوحہ مملکتیں آہستہ آہستہ آزاد کردی ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ آج کسی بھی ملک پر زبردستی اجارہ داری قائم نہیں رکھی جاسکتی، میں بھارتی حکمرانوں سے سوال کرتا ہوں کہ آپ نے باون (52) سال کشمیر پر بالجبر حکومت کر کے کیا حاصل کیا؟ اور آئندہ یہ ہٹ دھرمی جاری رکھی تو بھی آپ کیا حاصل کرسکیں گے ؟ کشمیر فطری طور پر بھارت سے الگ ہے، اسے بزور بھارت کا حصہ نہیں بنایا جاسکتا لہٰذا بھارتی حکمرانوں کو حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے اور کشمیریوں کو ان کی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے کا حق دیدینا چاہیے اسی میں بھارت سمیت سب کا بھلا ہے۔ روس جیسا ملک افغانستان نے پر اپنا قبضہ برقرار نہیں رکھ سکا وہ عاقبت اندیش تھا اس نے جلد ہی سمجھ لیا کہ اب کوئی ملک دوسرے ملک پر زبردستی حکومت نہیں کرسکتا وہ اس محاذ آرائی میں اربوں روبل اور ہزاروں جانوں کا نذرانہ دے کر افغانستان سے دستبردار ہوگیا۔ جبکہ بھارت کھربوں ڈالر خرچ کر کے اور لاکھوں جانوں کی بھینٹ دے کر وہیں کا وہیں ہے کشمیری آج ۵۲ سال بعد بھی آزادی کا پرچم بلند کیے ہوئے ہیں اور بھارت کی حکمرانی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں امریکہ اور یورپی برادری صرف رسماً بھارت سے کہتی ہے کہ وہ کشمیر کا فیصلہ کرے درحقیقت وہ کبھی نہ چاہے گی کہ بھارت اور پاکستان آپس میں اچھے پڑوسی کی حیثیت سے رہیں اگر یہ دوست ہوگئے تو ان کا اسلحہ کون خریدے گا ان کا بنایا ہوا سامان کہاں کھپے گا کیونکہ 125 کروڑ انسانوں کی منڈی صرف ہندوستان اور پاکستان کے عوام کی ہے جس میں پچاس یورپی ممالک بن سکتے ہیں وہ کیسے انہیں دوست دیکھ سکتے ہیں انہوں نے انڈونیشیا میں کاروائی کر کے راتوں رات مشرقی تیمور کو ایک آزاد ملک بنوادیا اگر وہ پاکستان بھارت اور کشمیریوں سے مخلص ہیں تو کشمیر میں باون برس

سے کھیلی جانے والی خون کی ہولی پر خاموش کیوں ہیں کشمیریوں پر ظلم انہیں کیوں نظر نہیں آتا انہیں آزادی کا حق کیوں نہیں دلاتے ؟ افغانستان میں روس کی فوج کشی کے خلاف کیون پاکستان کی مدد کی اور افغانستان کو آزاد کروایا؟ کیوں عراق سے کویت کو دوبارہ آزاد کرایا؟ کیا وہ ہندوستان کی جارحیت کے خلاف خود میدان میں نہیں آسکتے تھے۔ یقینا یہ ان کے مفادات کی جنگ ہے ہندوستانی حکمرانوں نے اگر آج کشمیر کو آزاد نہیں کیا تو کل وہ مزید قیمت ادا کر کے بھی اس پر مسلط نہیں رہ سکتے اور ایک دن ان کو کشمیر کو آزاد کرنا ہوگا بہتر یہی ہے کہ مذاکرات کے ذریعے عزت کے ساتھ کشمیر کو آزاد کر کے ہندوستانی عوام کی خوشحالی کے لیے کام کریں۔ اور پاکستان کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کر کے ایشیا کے دو اچھے پڑوسیوں کی طرح شیر وشکر ہو جائیں۔ بھارتی عوام کشمیر کی لاحاصل جنگ سے اکتا چکے ہیں آج ریفرنڈم کرالیں کشمیری وہی فیصلہ کریں گے جو باون سال پہلے کیا تھا۔

فراڈ کے نئے انداز

ایک سچا واقعہ ہمارے بچپن کا سنیئے اگر چہ معمولی سا تھا مگر اس واقعہ کے اثرات ہماری پوری زندگی پر مرتب ہوئے ہم ان دنوں صبح صبح برنس گارڈن کی سیر کو جاتے تھے ہمارے ساتھ ایک دو دوست بھی ہوتے تھے راستے میں اکثر ہم دیکھتے تھے کہ ایک آدمی تین تاش کے پتے والا کھیل ''مانگ پتا'' کھیل رہا ہوتا تھا اور لوگ اس پر روپے لگا کر ہار جیت رہے ہوتے تھے کئی دن تک ہم دوستوں نے بھی رک کر یہ تماشا دیکھا معلوم ہوا کہ ایک بادشاہ، ایک اکہ (یکہ) اور ایک کوئین (Queen) کے پتے تھے۔ آپ کو اس میں صرف اکا بتانا ہوتا تھا۔ اگر آپ نے صحیح اکا بتا دیا تو لگائی گئی رقم کی دوگنی رقم مل جاتی تھی ورنہ آپ کی رقم ہضم۔ ہم نے اکثر لوگوں کو ہارتے ہوئے ہی دیکھا مگر ایک شخص ہمیشہ جیتتا تھا۔ وہ دوسروں کو بھی مشورہ دیتا رہتا تھا۔ ہم سے نہیں رہا گیا سوچا چلو کل ہم تینوں دوست بھی قسمت آزمائیں گے۔ اگلے روز ہم تینوں نے گھر سے پچاس پچاس روپے لیے آج سے تقریباً تیس پینتیس سال پہلے کا یہ واقعہ ہے پچاس روپے آج کے پانچ ہزار روپے (5000) کے برابر سمجھے جائیں۔ چنانچہ ہم چہل قدمی کے بعد واپس اس جگہ آئے جہاں یہ جوا سڑک کے کنارے ہوتا تھا' یہ جگہ برنس گارڈن سے ملحق ہی تھی صبح کے وقت لوگ بھی برائے نام ہی ہوتے تھے زیادہ تر تعداد صبح کی چہل قدمی کرنے والوں کی ہوتی تھی۔ بہر حال ہم نے باری باری پتوں پر پیسے لگانے شروع کر دیئے۔ ایک بات یہ نوٹ کی وہ شخص جو روز جیتتا تھا آج بھی جیت رہا ہے اس نے ایک بار ہم سے پوچھے بغیر ہماری طرف سے دس روپے لگا دیے جب پتا پلٹا تو وہ واقعی اکا تھا اس نے دس کے بدلے بیس روپے لے لیئے اور دس روپے ہم کو دے دیے ہم نے پہلے تو لینے سے انکار کیا۔ جب اس نے زیادہ اصرار کیا تو ہم نے بھی رکھ لیے اب وہ ہمارے ساتھ مل کر کھیلنے لگا۔ ہماری عمریں زیادہ نہیں تھیں اور نہ ہی ہم نے زندگی میں کبھی جوا کھیلا تھا جبکہ وہ چالیس پینتالیس سال کا ہٹا کٹا شخص تھا۔ اب وہ ہماری طرف سے آزادی سے کھیل رہا تھا کبھی جیتتا اور کبھی ہارتا وہ اپنی

طرف سے لگاتا تو یقیناً جیتتا جس کی وجہ سے ہمارے منہ میں پانی آرہا تھا کہ کاش وہ بازی ہماری طرف سے لگاتا تو ہم اس جیت کے مستحق ہوتے آہستہ آہستہ کھیل ہوتا رہا اچانک اس نے ہماری طرف سے ایک دم سو روپے کی شرط لگادی ہم سے پوچھا بھی نہیں مگر ہم تو اس کی جیت کی مکن میں تھے۔مگر جب پتا کھلا تو ہم ہار چکے تھے اب ہمارے پچاس روپے بچے تھے اس نے پھر ہم سے پوچھے بغیر ایک سو روپے کا پتا مانگ لیا کیونکہ وہ کئی دفعہ ہم کو دس دس روپے جتا چکا تھا اور خود تو وہ کافی روپے جیتے ہوئے تھا اور ہم کو بھی اعتمادی میں لے چکا تھا ہم خاموش رہے پتا کھلا تو پھر ہم ہار گئے ہمارے پاس صرف پچاس روپے باقی رہ گئے تھے تو اس نے کہا یار کوئی بات نہیں پچاس روپے میں تمہیں دیے دیتا ہوں کیا ہوا اگلی بازی جیت جائیں گے اگلی بازی اس نے اپنی طرف سے دو سو روپے کی لگائی اور جیت گیا ہم کو اپنے ڈیڑھ سو اور پچاس روپے قرض والے یعنی دو سو روپے کے ہارنے کا افسوس ہو رہا تھا ہاں ایک بات میں بھول ہی گیا۔اس نے یہ دو سو روپے والی بازی بھی پہلے ہماری طرف سے لگانے کی پیشکش کی تھی۔مگر ہم نے اس کو منع کر دیا تھا۔اس وجہ سے اور بھی افسوس ہو رہا تھا کہ کاش ہم نے اس کی بات مان لی ہوتی تو ہم دو سو روپے جیت گئے ہوتے۔ہم دوستوں نے پھر مشورہ کیا کہ اس کے ساتھ ایک بازی اور آزمائی جائے تاکہ کم از کم اپنے اور قرض کے پیسے اتار سکیں۔چنانچہ اس نے اب کی دو سو روپے والی بازی ہماری طرف سے لگادی پھر وہی ہوا کہ ہم ہار گئے اب ہم اس کے ڈھائی سو روپے کے مقروض ہو چکے تھے۔اور ہمارے ڈیڑھ سو روپے الگ جا چکے تھے سخت پریشانی کا عالم تھا صرف آدھے گھنٹے میں ہم ڈیڑھ سو اپنے اور ڈھائی سو روپے اس شخص کے ہار چکے تھے ہمارے پاس مزید رقم بھی نہیں تھی جو ہم ادا کرتے جو رقم ہم لائے تھے وہ بھی اپنی بچت کی کل رقم تھی ہم کو اس زمانے میں دس روپے جیب خرچ ملتے تھے اس کو ہم کہاں سے ڈھائی سو روپے ادا کریں؟ تینوں دوست پریشان تھے مگر وہ بڑا سکون سے کھیل کر مسلسل اپنی طرف سے لگائی جانے والی بازی جیت رہا تھا اس نے پھر پیشکش کی کہ ہم چاہیں تو وہ اب بھی ہماری طرف سے بازی لگا سکتا ہے مگر ہم تینوں نے فیصلہ کیا کہ مزید نہیں کھیلیں گے ہمارے انکار پر تو اس نے اچانک ہی طوطے کی طرح آنکھیں بدل لیں کہاں تو خوشی خوشی ہماری طرف سے رقم لگانے کو تیار تھا کہاں ایک دم بے مروتی اوڑھ لی نہایت سختی سے کہا کہ نکالو میرے ڈھائی سو روپے اب ہم اور ڈر گئے کہ اگر ہمارے والدین کو معلوم ہوا تو پٹائی الگ ہوگی ہم نے اس کی منت سماجت کی کہ ہم کل تمہارے پیسے لا دیں گے۔مگر وہ نہیں مانا پتے لگانے والا شخص بھی اس کی حمایت میں پیش پیش تھا اور ہماری بات کوئی بھی نہیں مان رہا تھا۔بڑی مشکل انہوں نے ہماری گھڑیاں سے ایک دوست چشمہ لگائے ہوا تھا وہ اور تینوں کے جوتے ضمانت کے طور پر رکھ لیے ہم ننگے

پاؤں بغیر گھڑیوں اور چشمے کے چھپتے چھپاتے گھر لوٹے تینوں نے اپنے اپنے والدین کو تو کچھ نہیں بتایا البتہ اپنے دوستوں سے اپنے پنے حصہ کی رقم یعنی 80 روپے فی کس ادھار لے کر اسی وقت واپس آئے اور اپنی اپنی چیزیں واپس لیں پھر تمام زندگی جوانہ کھیلنے کی قسم کھائی چند روز بعد اتفاقاً ہم برنس روڈ پر ایک ہوٹل میں چائے پینے گئے تو دیکھا کہ وہی افراد ہوٹل میں بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں اور گپ شپ بھی کر رہے ہیں۔ان میں وہ شخص بھی شامل تھا جو روز جیتتا تھا اور جس نے ہماری طرف سے بازیاں لگائی تھیں تب جا کر سمجھ میں آیا کہ یہ تینوں آپس میں ملے ہوئے تھے اور ہم جیسے معصوم اور سادہ لوح لوگوں کو لوٹتے تھے۔اور یہ کاروبار آج بھی جاری ہے بلکہ اب تو نئے نئے سائنٹیفک طریقے نکل آئے ہیں۔حال ہی میں ہم کو ایک خط نائیجیریا سے موصول ہوا اس میں لکھا تھا کہ میں ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر ہوں اور میرے دوستوں کا ایک بہت بڑا حلقہ ہے مجھے لاکھوں ڈالر کی چیزیں پاکستان سے خریدنا ہیں میں امریکی تیل کمپنی کا بہت بڑا افسر تھا اور میرے پاس تین ملین ڈالر کی چیزیں ہیں جو میں ملک نائیجیریا سے باہر نہیں لا سکتا اگر آپ کا فارن کرنسی بینک اکاؤنٹ ہو تو میں یہ رقم آپ کے بینک میں ٹرانسفر کروا کر پاکستان آسکتا ہوں پھر ہم مل کر بزنس کریں گے وغیرہ وغیرہ ہم نے مشورہ کیا اس پر جو پتہ لکھا تھا اس پر مزید معلومات کے لیے لکھا۔اس کا بھی اس نے بڑا تسلی بخش جواب دیا مگر ہمارا دل نہیں مانا کہ یہ کیسا شخص ہے جس کو ہم نہیں جانتے اور وہ بھی ہمیں نہیں جانتا تین ملین ڈالر ہمارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروانا چاہتا ہے انہی دنوں مجھے دوبئی جانے کا اتفاق ہوا میں نے اپنے ایک دوست سے اس کا ذکر کیا تو اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر اپنا واقعہ سنایا کہ اس کو بھی اسی قسم کا خط ملا تھا اس نے خوشی خوشی اپنا دوبئی کا اکاؤنٹ نمبر دے دیا اور خوشی کی گھڑیاں گننے لگا کہ کب تین ملین ڈالر آتے ہوں گے ایک دن اس کے بینک سے فون آیا کہ کیا آپ نے ایک لاکھ ڈالر نائیجیریا ٹرانسفر کرنے کا فیکس کیا ہے اس نے کہا کہ میں نے تو کوئی فیکس نہیں کیا اس نے کہا مگر دستخط تو آپ ہی کے ہیں اس نے کہا کہ میں ابھی بینک آتا ہوں بینک جا کر دیکھا تو واقعی اس کے دستخط تھے اور لکھا تھا کہ ارجنٹ ایک لاکھ ڈالر فلاں شخص کو ٹرانسفر کر دو اور اکاؤنٹ نمبر بھی اسی کا تھا تب اس کی سمجھ میں یہ فراڈ آیا کہ چونکہ اس نے اپنا اکاؤنٹ نمبر لکھا تھا اور خط کے آخر میں دستخط بھی کیے تھے تو اس نے اس دستخط کو دوسرے کاغذ پر منتقل کر کے اور اکاؤنٹ نمبر دے کر بینک کو فیکس کر دیا وہ تو اس کی خوش قسمتی تھی کہ بینک نے بھیجنے سے پہلے تصدیق کر لی ورنہ عام طور پر بینک دستخط اور اکاؤنٹ نمبر ملا کر پیسے بھیج دیتے ہیں آج کل اس قسم کے خطوط کی بھرمار ہو رہی ہے پاکستان میں تو میرے کافی دوستوں کو مل چکے ہیں۔نہ جانے کتنے معصوم اس جال میں پھنس چکے ہونگے اس سے سب کو ہوشیار رہنا چاہیئے اسی طرح آج کل یورپ میں لاٹریوں کی بھرمار

ہے ہر کوئی کروڑوں ڈالر کا لالچ دے کر معصوم شہریوں سے رقمیں بٹور رہا ہے یہ نام نہاد لاٹریاں چھوٹے چھوٹے سے کرائے کے کمروں پر مشتمل ہوتی ہیں اور پی او بکس پر دھندا کر رہی ہوتی ہیں۔ یہ کسی طرح آپکا پتہ لے کر آپ کو رنگ برنگے لالچ دیتی ہیں۔ جس سے ہمارے تاجر حضرات بالخصوص راتوں رات ارب پتی بننے کے لالچ میں اپنی رقمیں لٹا دیتے ہیں کئی دفعہ میں نے خود ان جگہوں پر جا کر تصدیق کی تو معلوم ہوا کہ اس کمرے میں دس الگ الگ کمپنیاں کھلی ہوئی ہیں کیونکہ مجھے اکثر باہر جانا ہوتا رہتا ہے تو میں صرف اپنی معلومات میں اضافہ کے لیے خاص طور پر ایسی پیشکشوں کا خود جائزہ لیتا ہوں اور اپنے بھائیوں سے بھی کہتا ہوں کہ کوئی آپ کو راتوں رات امیر نہیں بنا سکتا اگر ایسا ہو تو وہ خود یہ دھندا کیوں کرے دوسروں کو ارب پتی بنانے والے خود ارب پتی کیوں نہیں ہیں؟ لہذا ایسے فراڈوں سے بچنا چاہیے اور اپنی جائز کمائی پر بھروسہ کرنا چاہیے ان واقعات کا اس لیے ذکر کیا کہ آج کل یورپ اور امریکہ میں یہ فراڈیوں عام ہو چکے ہیں۔ لوگ ان پر کان نہیں دھرتے اس لیے اب انہوں نے اپنا رخ ہماری طرف موڑ دیا ہے کیونکہ ہم امریکہ اور یورپ سے بہت مرعوب ہیں اور ایسے دھوکا بازوں کے لیے نرم چارہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

خودی کا سبق آج پھر سے یاد کر لیں

اس وقت ہم نے تمام انرجی صرف دو باتوں پر صرف کر رکھی ہے۔ پہلی یہ کہ پاکستان آیا سی ٹی بی ٹی (CTBT) پر دستخط کرے یا نہ کرے اور دوسری بات یہ کہ صدر کلنٹن پاکستان کا دورہ کیوں نہیں کر رہے ہیں۔ تمام حلقے اس بات پر متفق ہیں کہ جب تک ہندوستان سی ٹی بی ٹی پر دستخط نہ کرے۔ پاکستان کو بھی دستخط نہیں کرنا چاہئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صرف پاکستان پر اتنا دباؤ کیوں ڈالا جا رہا ہے اور بھارت کو کوئی کچھ کیوں نہیں کہتا۔ خود صدر کلنٹن نے سی ٹی بی ٹی پر تو دستخط کر دیئے مگر سینیٹ نے اس کی توثیق کرنے سے انکار کر دیا اور کہا ہے کہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط خود امریکہ کے مفاد میں نہیں ہے۔ سینیٹ میں چونکہ ری پبلکن کی اکثریت ہے۔ اسی وجہ سے صدر کلنٹن کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ سینیٹ کا اعتراض کسی مفروضے یا جماعتی مخالفت کے سبب نہیں ہے بلکہ واقعی اس کی توثیق سے امریکی مفادات کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اسی وجہ سے سینیٹ اس کی توثیق نہیں کرنا چاہتی۔ حالانکہ یہی سینیٹ تھی جس نے مونیکا کے مواخذے میں صدر کلنٹن کو معاف کر دیا تھا۔ ان کے نزدیک مواخذہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا تھا بلکہ امریکیوں کا مفاد اس میں تھا کہ صدر کلنٹن اپنی میعاد پوری کر لیں کیونکہ انہوں نے امریکہ کے لئے اپنے دور میں بہت کارنامے انجام دیئے تھے کلنٹن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے کھربوں ڈالر کا خسارہ منافع میں تبدیل کر کے امریکی معیشت کو مستحکم بنا دیا اور خود کو امریکی عوام سے کامیاب ترین صدر منوالیا ہے اور آنے والے انتخابات میں ڈیموکریٹ امیدوار کے لئے راستہ بھی کھول دیا ہے۔ یقیناً ری پبلکن امیدوار کے لئے جیتنا اگر ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا۔ اس لئے کہ امریکی عوام اپنے صدر کے چناؤ میں بہت محتاط اور آزاد ہوتے ہیں۔ کوئی بھی غلطی راتوں رات پانسا پلٹ سکتی ہے۔

دوسری اہم بات صدر کلنٹن کے دورہ بھارت اور بنگلہ دیش سے متعلق ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ چونکہ پاکستان

میں منتخب حکومت کے بجائے فوجی حکومت ہے اس لئے صدر کلنٹن کا پاکستان آنا جمہوریت کے مفاد میں نہیں ہوگا۔ میرے خیال میں صدر امریکہ کا پاکستان کا دورہ نہ کرنا خود امریکہ کے مفاد میں نہیں ہے۔ وہ اگر اس دورے سے کشمیر کا مسئلہ حل کروادیں تو خطے میں امن قائم کر کے تاریخ میں اپنا نام امر کرواسکتے ہیں۔

ایک طرف ان کو بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان کی کھلی منڈی ملے گی جن کی کل آبادی 140 کروڑ نفوس پر مشتمل ہے۔ دوسری طرف پاک بھارت جنگ کا خطرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے گا۔ اگر انہوں نے پاکستان کا دورہ نہ کیا تو بھارت اور شیر ہوکر پاکستان پر دباؤ بڑھائے گا جس کی وجہ سے کشمیر کا مسئلہ پھر کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ بھارت کی پوری کوشش یہی ہوگی کہ وہ امریکی صدر کو پاکستان کا دورہ نہ کرنے دے۔ موجودہ وزیراعظم واجپائی انڈین ایئرلائن کے جہاز کے اغواء کے واقعے میں اپنی تمام توانائیاں پاکستان کو اس میں ملوث کردینے اور اسے دہشت گرد ثابت کردینے میں صرف کر چکے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ خود امریکی صدر اور نیپال کی حکومت نے جہاز کے اغواء میں پاکستان کے ملوث ہونے کی بھرپور تردید کردی ہے۔ اب بھارتی حکومت اس ناکامی کا بدلہ لینے کے لئے اس بات پر اپنی پوری توجہ صرف کئے ہوئے ہے کہ امریکی صدر پاکستان کا دورہ نہ کرسکیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ فوجی حکومت کے دور میں امریکی نمائندے اور سینیٹر صرف چار ماہ کی مختصر مدت میں پاکستان کے اتنے دورے کر چکے ہیں کہ نواز شریف کے ڈھائی سالہ دور میں نہیں کئے تھے اور اسی مدت میں امریکہ نے ایک بلین ڈالر کے قرضے ری شیڈول کردیئے ہیں۔ اسی طرح یورپ اور روس نے بھی ایک بلین ڈالر سے زیادہ کے قرضے اسی فوجی حکومت کے دور میں ری شیڈول کر کے بالواسطہ اس حکومت کو تسلیم کرلیا ہے اور چینی حکومت نے تو نہ صرف ایک بلین ڈالر کے قرضے ری شیڈول کئے بلکہ اس پر تمام سود بھی معاف کردیا ہے۔ یہی وہ چینی حکومت ہے جو نواز شریف دور میں پاکستان کی پالیسیوں سے خوش نظر نہیں آتی تھی۔ گویا موجودہ حکومت کو اپنے اور غیر سب ہی سابقہ حکومت سے بہتر قرار دے رہے ہیں۔ خود امریکی نیشنل کونسل کے رکن ڈیوڈ لیوی نے حکومت پاکستان سے دہشت گردی کے خاتمے کے لئے مدد طلب کی ہے اور اس بات کا عندیہ دیا ہے کہ پاکستان کے خلاف دہشت گردی کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔ یہ صرف بھارتی پروپیگنڈہ ہے۔ پاکستان ایک امن پسند ملک ہے اور وہ اپنے پڑوسیوں سے بھی امن کی توقع رکھتا ہے۔ پاکستان کی سرحدیں چین، روس، ایران اور افغانستان سے بھی تو ملتی ہیں۔ ان کو کیوں پاکستان سے شکایت نہیں ہے۔ صرف بھارت ہی پاکستان پر الزام تراشی کرتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستانی میڈیا بھی مضبوط ہو اور عالمی برادری میں ہمارے سفارت خانے اپنا فعال کردار ادا کریں۔ اس کے لئے انہیں

صرف منظم (Organize) کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا ٹی وی چینل اس معاملہ میں بہت پیچھے ہے خصوصاً عالمی سطح پر تو بہت کمزور ہے جبکہ بھارت اس میں بہت آگے ہے ہم دہشت گردی کے خود شکار ہیں مگر دنیا ہم کو دہشت گرد سمجھتی ہے اور عالمی سطح پر ایسا لگتا ہے کہ پاکستان میں سیکورٹی رسک ہے مگر جب بیرون ممالک سے یہی سیاح آتے ہیں تو وہ حیران رہ جاتے ہیں کہ پاکستان میں ایسی دہشت گردی نظر نہیں آتی جیسا کہ ان کے ملک میں بھارت کا پروپیگنڈا بتاتا تھا کہ پاکستان میں ہر طرف دہشت گردی ہی دہشت گردی ہے۔

میں اس سے پہلے بھی تحریر کر چکا ہوں کہ موجودہ حکومت کی سب سے بڑی ترجیح ملکی معیشت کی بحالی ہونی چاہئے۔ اس کے لئے صنعت کاروں کو مراعات دی جائیں۔ زرعی شعبوں میں انقلابی تبدیلیاں لانی چاہئیں۔ جب تک ہماری معیشت مضبوط نہیں ہوگی ہمارے عوام غربت اور جہالت میں جکڑے رہیں گے اور دنیا میں ہمارا کوئی مقام نہیں ہوگا ہم سے بھی بعد میں وجود میں آنے والے ممالک ہم سے کہیں آگے جا چکے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے ٹھوس منصوبہ بندی کی ہے۔ ہم صرف فوری اور مصنوعی طریقے سے معیشت کو بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ حقیقی طریقے اختیار کرنے سے ہم اب بھی گریزاں ہیں۔ جب تک ہم بنیادی صنعتیں نہیں لگاتے اور جدید طریقوں سے اپنی زمینیں سیراب نہیں کرتے ہم اسی طرح مقروض کے مقروض رہیں گے۔ ہمیں کسی صدر کے دورے کا انتظار نہیں کرنا چاہئے بلکہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرنی چاہئے۔ خدا بھی انہیں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کے اصول اپناتے ہیں اور اپنی خودداری کو گروی نہیں رکھتے۔ اگر ہم نے علامہ اقبال کی خودی کا سبق آج پھر سے یاد کرلیا تو ہم خود کسی عظیم قوم سے کم نہیں ہیں۔

ایک اور جو ہماری ٹیم کے ساتھ

آسٹریلیا میں بھارت پاکستان اور آسٹریلیا کے مابین ہونے والے سہ فریقی ون ڈے میں ہم میزبان ٹیم سے فائنل میں دو صفر سے پھر ہار گئے۔ ہمارے ابتدائی کھلاڑی سابقہ روایت برقرار رکھتے ہوئے جلد بازی میں یکے بعد دیگرے آؤٹ ہوتے گئے اور بعد میں آنے والے کھلاڑیوں پر بوجھ بڑھتا گیا۔ کئی بار ہمارے ابتدائی پانچ مستند کھلاڑی پچاس رنز کا ہدف بھی عبور نہیں کر سکے اور انتہائی غیر ذمہ دارانہ بیٹنگ کا مظاہرہ کر کے ٹیم کو مشکل میں ڈالتے رہے اور جب فیلڈنگ کا وقت آتا تو ابتدائی اوور میں شعیب اختر اور وسیم اکرم کی باؤلنگ کے دوران دو تین اہم کیچ ضرور ڈراپ کئے جاتے رہے۔ آسٹریلیا کی ٹیم کے خلاف ہم نہ جانے کیوں مسلسل نفسیاتی دباؤ کا شکار رہے اور ایک میچ کے سوا تمام میچ ہار گئے فائنل کے دونوں میچ تو ایسے ہارے جیسے پاکستان کی قومی کرکٹ ٹیم نہیں گلی کوچوں میں کھیلنے والی شوقیہ نوجوانوں کی کوئی ٹیم کھیل رہی ہو۔ مگر جب یہی ٹیم بھارت کے خلاف میچ کھیل رہی ہوتی تھی تو اس کی فیلڈنگ بیٹنگ دونوں کا معیار آسٹریلوی ٹیم کے مقابلے میں بالکل مختلف ہوتا تھا۔ وہی بلے باز جو بھارتی بولروں کا جم کر سامنا کرتے اور بلے بازی کے جوہروں کا بھرپور مظاہرہ کرتے آسٹریلوی باؤلرز کے سامنے ڈھیر ہو جاتے۔ وہ کھلاڑی جو بھارت کے خلاف نپی تلی باؤلنگ اور بہترین فیلڈنگ کا مظاہرہ کرتے۔ آسٹریلیا کے سامنے جگ ہنسائی کرواتے اور ہر میچ میں چار پانچ کیچ ضرور گراتے۔ آسٹریلیا کو ایک طرف ہوم کراؤڈ کا ایڈوانٹیج تھا تو دوسری طرف ان کے امپائر بھی متنازعہ (Controversial) فیصلے کرتے رہے اور تمام فیصلے میزبان ٹیم کے حق میں دیئے گئے اور کئی فیصلے تو صریحاً جانبدارانہ تھے خاص طور پر کئی صاف ایل بی ڈبلیو کھائے گئے۔ کمنٹیٹر بار بار ایکشن ری پلے پر تبصرہ یہی کر رہے تھے اور کھیل کے دوران اور کھیل کے بعد بھی یہ متنازع فیصلے ری پلے میں دکھا کر باور کراتے گئے کہ آسٹریلوی امپائر اپنی ٹیم کے حق میں فیصلے دے رہا ہے مگر نہ تو تھرڈ امپائر نے اس پر کوئی فیصلہ دیا اور نہ ہی آئی سی

سی نے اس امپائر کے خلاف تادم کوئی کارروائی کی۔ اگر یہ متنازعہ فیصلے بھارت یا پاکستان کے امپائر کرتے تو نہ صرف ان کے خلاف کارروائی کی جاتی بلکہ انہیں بدنام بھی کیا جاتا۔

الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے جو سہولتیں' فیصلوں کے درست یا نادرست ہونے کا فیصلہ کرنے کے حوالے سے حاصل ہیں ان کا فائدہ گورے صرف خود اٹھاتے ہیں۔ بھارت' پاکستان' سری لنکا' ویسٹ انڈیز کے لئے کوئی آواز بلند نہیں کرتا اور یہ گورے جب چاہتے ہیں جیسا چاہتے ہیں ویسا قانون بنا لیتے ہیں۔ کبھی ان کے امپائر سری لنکا کے مرلی دھرن کے پیچھے پڑ جاتے ہیں تو کبھی شعیب اختر کا ایکشن ان کو غلط نظر آنے لگتا ہے جس باؤلر کو ان کے کھلاڑی نہیں سمجھ سکتے۔ اس باؤلر کو ان کے امپائر' جنہوں نے خود ایک میچ بھی نہیں کھیلا ہوتا' غلط قرار دے کر اس کے مستقبل کو تاریک بنانے سے ذرا نہیں چوکتے اور ہمارا کرکٹ کنٹرول بورڈ خاموش تماشائی بنا رہتا یا پھر اس قدر بودا احتجاج کرتا ہے کہ کہیں ان کی بات گوروں کی طبع نازک پر گراں نہ گزرے۔ وقت آ گیا ہے ہم سب مل کر چونکہ اکثریت ہماری ہے۔ کرکٹ سے گوروں کی اجارہ داری قوانین ختم کروائیں۔ اور من مانے قوانین بنانے سے روک دیں۔ یہ لازم قرار دیا جانا چاہئے کہ کسی بھی ملک میں میزبان ملک کا امپائر نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ وہ جانبداری کا شکار ہو کر اپنے ملک کے حق میں فیصلے دے دیتا ہے۔

ایک طرف تو کھلاڑیوں پر کڑی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں کہ امپائر کے خلاف کوئی بات زبانی یا ایکشن کے ذریعے نہیں کی جا سکتی ہے تو دوسری طرف امپائروں کو چھوٹ دی گئی ہے کہ وہ جب چاہیں' جس کے خلاف چاہیں غلط اور متنازع فیصلے دے کر ٹیم کو جتوا دیں۔ پہلے چونکہ ٹیلی ویژن میں ایکشن ری پلے نہیں دکھایا جا سکتا تھا نہ تھرڈ امپائر ہوتا تھا نہ وکٹ کے نیچے ساؤنڈ اسپیکر ہوتا تھا اور نہ ایل بی ڈبلیو کی لائنیں دکھائی جاتی تھیں۔ اس لئے امپائر کا فیصلہ آنکھوں کے فوری ردعمل سے ظاہر ہو جاتا تھا مگر اب تو بار بار ری پلے دکھانے سے صحیح اور غلط کا فیصلہ واضح طور پر ہو جاتا ہے۔ ایک تو ٹی وی پر ہمارے ملک کا کوئی تبصرہ نگار بھی نہیں ہوتا جو عوام کی توجہ مبذول کروائے اور یہ گورے تبصرہ نگار صرف یہ کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں کہ امپائر کا فیصلہ آخری فیصلہ ہے اور اگر یہی امپائر ان کے خلاف فیصلہ دے تو چیخ چیخ کر کان کھا جاتے ہیں کہ تعجب ہے' یہ غلط فیصلہ امپائر کو نہیں دینا چاہئے اور بار بار ایکشن ری پلے دکھا دکھا کر باور کراتے ہیں کہ یہ فیصلہ غلط تھا اور اگر وہ میچ ہار جائیں تو ساری ذمہ داری امپائر پر ڈال دیتے ہیں۔

اس شرمناک شکست کے بعد ہمارے کرکٹ کے کرتا دھرتا ایک مرتبہ پھر بیٹھ گئے اور عجلت میں تمام سینئر کھلاڑیوں کو یکدم ٹیم سے نکال باہر کر دیا۔ وسیم اکرم کو کپتانی سے ہٹا دیا اور بیچارے سعید انور کو انتہائی کمزور اور نو

آزمودہ کھلاڑیوں پر مشتمل ٹیم بنا کر دے دی وہ بیچارہ کپتان بننے کی خوشی میں بھول گیا کہ اس نئی ٹیم کے ساتھ وہ سری لنکا کے مقابلے میں کیا حکمت عملی اختیار کرے جب نومستند بیٹسمینوں سے ٹیم نہیں جیتی تو صرف عامر سہیل' خود کپتان' یونس' عبدالرزاق سے کیسے بیٹنگ آرڈر چلے گا۔ یعنی بھارت کی طرح ''اگر ٹنڈولکر آؤٹ تو پوری ٹیم آؤٹ'' اب یہ ہوگا ''سعید انور آؤٹ تو پوری ٹیم آؤٹ'' ہم ہمیشہ عجلت میں فیصلے کرتے ہیں' کبھی ٹیم سے باہر کسی کھلاڑی کو کپتان بنا کر لے آتے ہیں یا پھر ساری کی ساری ٹیم کو باہر کر دیتے ہیں۔ پاکستان کی اتنی کمزور ٹیم تو شاید اس وقت بھی نہیں تھی جب ہمارے تمام سینئر کھلاڑی کیری پیکر کی ٹیم میں شامل ہو گئے تھے اور ہم سب سے ہار رہے تھے جب کیری پیکر کا زوال آیا اور ہم نے ان کھلاڑیوں کو معاف کر کے دوبارہ ٹیم بنائی۔ تب جا کر ہمیں جیتنے کے مواقع ملے اور ہماری ٹیم ورلڈ کپ بھی جیتی اور قبل ازیں ورلڈ کپ کے کم از کم فائنل میں آتی رہی۔ اب شعیب اختر پر پابندی تھی تو کم از کم وقار کو ڈراپ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ایک اینڈ وسیم اکرم سنبھالے گا تو دوسرا اینڈ شاہد نذیر کو رنہیں کر سکتا اور اگر کھیل میں وسیم اکرم کو کچھ ہو گیا اور دوسری طرف جے سوریا جم گیا تو ثقلین مشتاق کیا کر سکے گا۔ یہ بھی ہم نے سوچا؟ جبکہ ابتدائی دونوں میچ پی سی بی الیون سری لنکا سے ہار گیا۔ خاص طور پر دوسرے میچ میں تو پی سی بی الیون صرف 48 رنز پر ڈھیر ہو گئی جس میں دس کھلاڑی نئے تھے۔ پچاس اوور کا میچ سری لنکا نے صرف سات اوور میں جیت لیا۔ کیا ہم خود اپنے ہی ملک میں اپنا مذاق اڑوانا چاہتے ہیں اور دوبارہ وسیم اکرم کو کپتان بنوانے کے لئے ہم پانچ جونیئر اور تین ٹیم سے باہر کھلاڑی لا کر سعید انور کا کیریئر داؤ پر لگا کر سری لنکا جیسی ٹیم سے پاکستان کو ہروا کر جگ ہنسائی کا پروگرام ترتیب دے رہے ہیں؟ وسیم اکرم تو کسی نہ کسی طرح ٹیل اینڈر کو آؤٹ کر کے چار سو وکٹیں پوری کر لے گا اور ورلڈ ریکارڈ بنا لے گا مگر باقی ٹیم کا کیا ہوگا؟ اگر آنے والے ورلڈ کپ کے لئے نوجوانوں کو اکھا کرنا تھا تو ایک ایک دو دو کر کے ٹیم میں لاتے تاکہ سینئر کھلاڑی ان کے ساتھ ہوتے تو ان کو حوصلہ ملتا اور وہ ان کی رہنمائی بھی کرتے۔ اس طرح آہستہ آہستہ ہم ورلڈ کپ تک سینئر اور جونیئر کھلاڑیوں پر مشتمل ٹیم بنا سکتے تھے۔ پہلے ہمارے کھلاڑی جوا کھیلتے رہے۔ اب سلیکٹر ٹیم کی تشکیل میں نت نئے تجربے کر کے پوری ٹیم اور پاکستانی کرکٹ کے مستقبل کا جوا کھیل رہے ہیں۔ اللہ خیر کرے۔

24 گھنٹے اور 38 ڈکیتیاں

آج کی تازہ خبر یہ ہے کہ کراچی شہر میں 24 گھنٹوں میں صرف 38 ڈکیتیاں ہوئیں چار گزشتہ ماہ کی کارکردگی میں آج کی یہ خبر اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ آج تک ایک دن میں ہونے والی ڈکیتیوں کی تعداد سے سے زیادہ ہے اور تشویش ناک بھی ہے اور کراچی کے شہریوں کے لیے کربناک بھی ہے اور یہ ڈکیتیاں کسی ایک علاقے تک محدود نہیں ہیں۔ پہلے صرف پوش علاقوں میں ڈکیتیاں ہوتی تھیں جن میں بالخصوص کلفٹن، ڈیفنس اور سوسائٹی کے علاقے سرفہرست ہوتے تھے اب یہ وارداتیں بڑھ کر پہلے گلشن اقبال' ناظم آباد' فیڈرل بی ایریا میں ہوئیں۔ پھر چھوٹے چھوٹے مقامات لانڈھی' کورنگی' اورنگی کے گھروں تک پھیل گئی ہیں ایک زمانہ تھا جب کراچی روشنیوں کا شہر ہوتا تھا۔ پرامن اور رنگینیوں سے بھرپور دن اور راتیں ہوتی تھیں۔ تجارت اور صنعتیں سب سے زیادہ کراچی شہر کی میراث تھیں۔ جرائم ہوتے تھے مگر اس قدر سنگین نہیں زیادہ سے زیادہ چوری کی وارداتیں ہوتی تھیں۔ اسلحہ اور منشیات سے کوئی واقف نہیں تھا افغانستان کی جنگ نے ہم کو افغانی باشندوں کی کھیپ کے علاوہ اسلحہ اور منشیات تحفے میں دیں پہلے یہ پشاور تک محدود تھیں پھر ہر شہر میں باڑہ مارکیٹیں وجود میں آتی گئیں اسمگلروں نے پہلے امپورٹڈ مال کی اسمگلنگ شروع کی اور پھر آہستہ آہستہ چرس' افیون' ہیروئن کی اسمگلنگ بڑھی۔ پھر اسلحہ کی دوڑ میں مذہبی اور دیگر تنظیمیں ضیاء الحق کی مہربانی سے شامل ہو گئیں۔ شہر کے شہر اسلحہ سے بھر گئے اور آج کوئی بھی سیاسی مذہبی' لسانی الغرض کوئی تنظیم اسلحے کے بغیر نامکمل سمجھی جاتی ہے جس کے پاس جتنا جدید اسلحہ ہے وہ اتنی ہی مضبوط تنظیم سمجھی جاتی ہے۔

خود حکومت سندھ میں اس وقت حکومتی ذرائع کے مطابق پندرہ لاکھ سے زیادہ غیر قانونی ہتھیار موجود ہیں جبکہ پچاس سال میں صرف پانچ لاکھ لائسنس جاری کیے گئے ہیں جن میں سیکوریٹی کمپنیوں کے لائسنس بھی شامل ہیں آج فوجی حکومت کے دور میں سب سے زیادہ ضروری کام اسلحہ کی برآمدگی کا ہونا چاہیئے کیونکہ

ڈکیتیوں اور قتل وغارت کی وارداتوں میں یہی غیر قانونی اسلحہ استعمال ہوتا ہے، کراچی کے شہری کل بھی پرامن پڑھے لکھے، صاف ستھرے ماحول میں رہتے تھے اور آج بھی اکثریت اسی ماحول میں رہنا چاہتی ہے۔ تو پھر فوج سے یہ کام کیوں نہیں لیا جاسکتا' اس سے ایک طرف تو ڈکیتیوں کی روک تھام ہوسکے گی۔ دوسری طرف سرمایہ کاری دوبارہ شروع ہوگی اور کراچی کے باشندے فوج کے اس عمل سے خوش ہوں گے جس طرح گاؤں اور دیہات میں فوج بھل اور سیم کے خاتمے کے لیے کام کررہی ہیں شہر میں کرفیو لگا کر ایک یا دو دن میں تمام اسلحہ برآمد کرلیا جائے اس کے دو طریقہ کار وضع کیے جاسکتے ہیں اول عام معافی دے کر یہ اسلحہ قیمتاً لیا جاسکتا ہے یا پھر مدت گزرنے کے بعد گھر گھر تلاشی کرفیو لگا کر ممکن ہوسکے گی۔ کیونکہ خوف زدہ ماحول میں تو چڑیا کا بچہ بھی نہیں پنپ سکتا بھلا انسان کے بچے کیسے پنپیں گے اور چونکہ فوج ابھی تک سیاست میں ملوث نہیں ہے اور نہ ہی سیاست میں ملوث ہونا چاہتی ہے لہٰذا اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے اس کام کے لیے ہمارے وزیر داخلہ کراچی کے لیے موزوں ترین غیر متنازعہ شخصیت ہیں۔ صرف چند دن اس کام کو اپنی نگرانی میں کرا کر تمام اسلحہ برآمد کر کے کراچی کے شہریوں کو اس کربناک دور سے نکالیں اور جو بھی اس میں ملوث ہو اس کو عبرت ناک سزائیں دلوائیں حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ کراچی پاکستان کا واحد شہر ہے جس میں فوج اور رینجرز کی موجودگی کے باوجود کوئی بھی کمپنی اپنا مال مضافاتی علاقوں میں ٹرک اور گاڑیوں سے نہیں بھیجتی کیونکہ واپسی پر ان ہی گاڑیوں سے سامان اور فروخت ہونے والی رقوم چھیننے کی وارداتیں اتنی بڑھیں کہ سب نے فیصلہ کیا کہ کوئی بھی کمپنی اپنا مال ڈائریکٹ سپلائی نہیں کرے گی اب مضافاتی دوکاندار خود شہر آکر خرید وفروخت کرتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ کئی سال سے جاری ہے کیونکہ علاقے کے نوجوان گن پوائنٹ پر سپلائی کرنے والی گاڑی کو گلی میں لے جا کر مال اور پیسے لوٹ لیتے تھے اور شواہد یہی ہیں کہ علاقہ پولیس کا ان کو تعاون حاصل ہوتا تھا۔ کیونکہ لٹنے والی کمپنی کے مالکان جب علاقے کے تھانہ سے رجوع کرتے تھے تو ان کو یہی مشورہ دیا جاتا تھا کہ ان کا مال برآمد نہیں کرسکتے۔ کیونکہ ہماری جان کو خطرہ ہوگا۔ اگر ہم نے ان پر ہاتھ ڈالا اور اگر کام کسی کو پکڑنے کا ہوتا تھا تو یہی پولیس والے الیکٹرک سپلائی کمپنی کی سیڑھی لگا کر راتوں رات معصوم اور غریب لڑکوں کو پکڑ کر لاتے تھے۔ اور پھر پیسے لے کر چھوڑ دیتے تھے۔

پولیس اہلکاروں کے ڈکیتی کی وارداتوں میں بالواسطہ یا بلاواسطہ ملوث ہونے کی بات اب کچھ نئی نہیں رہی گزشتہ عرصے میں ایسے کئی واقعات سامنے آچکے ہیں تازہ واقعہ اسی ہفتہ کا ہے جب برنس روڈ پر بینک کے باہر ڈکیتی کی واردات ہوئی اسکوٹر پر سوار پر دو نوجوان گن پوائنٹ پر ڈکیتی کر کے فرار ہورہے تھے کہ پیچھے سے

پولیس وین آگئی۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ سامنے ڈاکو فرار ہورہے ہیں ان کو پکڑو تو بجائے اس کے کہ پولیس والے ان کا تعاقب کرتے لٹنے والے شخص سے طرح طرح کے سوالات شروع کردیئے (تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ کتنی رقم گئی ہے) اور دس منٹ تک بحث میں الجھائے رکھا۔ جب لوگوں نے پولیس کو برا بھلا کہنا شروع کیا تب وہ ڈاکوؤں کے تعاقب میں روانہ ہوئے مگر ظاہر ہے اتنی دیر میں ڈاکو کہیں کے کہیں پہنچ گئے اور یوں پولیس والوں نے ان کو پکڑنے کے بجائے فرار میں مدد دی اور رقم بھی معلوم کرلی تاکہ تقسیم میں آسانی رہے۔

چارہ ماہ قبل جب فوج نے اقتدار سنبھالا تھا تو چند دن کے لیے ڈکیتیاں اور گاڑیاں چھیننے کی وارداتیں کم ہوگئی تھیں۔ جوں جوں فوج کا اقتدار بڑھ رہا ہے توں توں ڈاکوؤں اور پولیس والوں کا خوف بھی کم ہوتا جارہا ہے اور اب یہ وارداتیں بڑی بڑی شاہراہوں پر دن دہاڑے ہونے لگی ہیں۔ اس سے فوج کے بدنام ہونے کا خطرہ ہے اور لوگ اب فوج سے بھی مایوس ہورہے ہیں ایک طرف کاروبار نہیں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بڑی تعداد بیروزگار ہے اس پر طرفہ تماشا کوٹہ سسٹم۔ مہنگائی نے عوام کی کمر توڑ رکھی ہے ان حالات میں اگر نوجوان ڈکیتیوں اور دیگر جرائم کی طرف راغب ہورہے ہیں تو یہ ایک فطری امر ہے پڑھ لکھ کر وہ کب تک جوتیاں چٹخاتے پھریں گے' کب تک دھکے کھائیں گے' وہ کب تک خالی ہاتھ اپنے گھروں کو لوٹتے رہیں گے ان گھروں میں دس دس کھانے والے ان کا انتظار کررہے ہوتے ہیں، لہٰذا نوجوانوں کو جرائم سے دور رکھنا ہے تو ان نوجوانوں کو روزگار فراہم کرنے ہوں گے۔ ہمارے وزیر داخلہ معین الدین حیدر صاحب کا کراچی میں بہت آنا جانا رہتا ہے صرف منصوبہ بندی اور اس پر عمل کی ضرورت ہے ہر کاروبار میں لاکھوں نہیں ہزاروں نہیں چند سو افراد شامل ہیں ان پر ہاتھ ڈالنا فوجی دور میں مشکل نہیں ہے' یہ بھی پتہ لگنا چاہیئے' کہ پشاور سے کراچی تک اسلحہ کیسے پہنچتا ہے' اس کو روکنے کے لیے ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہے' اگر فوری طور پر یہ اقدامات نہیں کیے گئے تو اس شہر وحشت کو گھن لگ جائے گا۔ اور اگر اس کو گھن لگا تو سمجھیں پورا ملک اس کی لپیٹ میں آجائے گا۔ آج چوبیس گھنٹوں میں کراچی شہر میں اڑتیس ڈاکے پڑے تو کل 24 گھنٹوں میں ڈاکوؤں کی سنچری بھی ہوسکتی ہے' ہمیں اس خطرے سے نمٹنے کے لیے پوری تیاری کر کے اس کا قلع قمع کرنا ہے، خدارا اس میں اب دیر نہ کریں۔

500 مکانات اپنے مکینوں کا کب تک انتظار کریں؟

آج سے تیس سال پہلے 1971ء میں سقوط ڈھاکہ ہوا اور پاکستان دولخت کر دیا گیا تو اس وقت دو مسئلے پیش پیش تھے پہلا 90 ہزار افواج پاکستان کو واپس لانے کا۔ دوسرا دس لاکھ پاکستانیوں کو' جن کو عرف عام میں بہاری کہا جاتا تھا پاکستان لا کر آباد کرنا شملہ معاہدے کے بعد ہمارے تمام فوجی جو بھارت کی قید میں تھے ایک سال بعد پاکستان آ گئے مگر بنگلہ دیش میں رہ جانے والے پاکستانیوں کو قانونی طور پر کوئی بھی نہیں لایا تو تقریباً آٹھ (8) لاکھ یہ پاکستانی ہندوستان، نیپال، برما کے راستے کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گئے۔

کیونکہ بھٹو صاحب نے بھی ان کو لانے کے لیے کوئی اقدامات نہیں کیئے تھے۔ اسی وجہ سے یہ خود لٹتے پٹتے پاکستان پہنچ گئے اسی طرح لاکھوں بنگالی بھی انہی راستوں سے غیر قانونی طور پر نوکریوں کی تلاش میں پاکستان پہنچ گئے۔

پھر ضیاء الحق کا دور آیا نہ صرف لاکھوں بنگالیوں کا بوجھ سندھ پر تھا اس سے زیادہ افغانی (چالیس لاکھ) پاکستان میں آ گئے اور زیادہ تر وہ بھی سندھ میں منتقل ہوتے گئے۔ صرف ڈھائی لاکھ بہاری اپنی کم مائگی اور دیگر وجوہات کی بناء پر پاکستان نہیں آ سکے وہ بنگلہ دیش میں ہی محصور رہ گئے انکو کئی شہروں میں کیمپوں میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کے پہلے دور میں ایک غیر سیاسی تنظیم ''کمیٹی برائے منتقلی محصورین پاکستانی'' ان باقی ڈھائی لاکھ محصور پاکستانیوں کو لانے کے لئے بنائی گئی جن میں پی۔ پی۔ پی کے علاوہ تمام سیاسی سماجی تنظیمیں شامل تھیں جن کا چیئرمین مجھے چنا گیا اس تنظیم نے دن رات کام کیا۔ جس میں بڑے بڑے اور چیدہ چیدہ سیاسی زعماء خاص طور پر جناب عبدالستار افغانی، الحاج شمیم الدین، میر نواز خان مروت (مرحوم)، زہیر اکرم ندیم (مرحوم) چوہدری افضال حاجی حنیف طیب، مرحوم نسیم حیدر ایڈوکیٹ، اختر حسین علوی، ملک محمد اختر، ناہید

افضال، احمد دلدار، عفیف حسن علوی، وداود ملک، محمد احمد صدیقی، مشتاق مرزا، مرحوم رشید احمد قدوائی، منور جمال وغیرہ وغیرہ شامل تھے اس کمیٹی کے وفد کو اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنجاب میاں نواز شریف صاحب نے 76 لاکھ روپے دیے تھے تاکہ عید کے موقع پر ان محصورین کو ایک لاکھ کپڑوں کے جوڑے خیر سگالی کے طور پر بھیجے جائیں چنانچہ کمیٹی نے ایک لاکھ دس ہزار جوڑے بھجوائے اور ان کے کیمپوں میں بین الاقوامی ریڈ کراس کے ذریعے تقسیم کروائے۔ چونکہ مرکز میں پی۔ پی۔ پی کی حکومت تھی۔ وہ ان محصورین کو نہیں لانا چاہتی تھی۔ جبکہ صوبے میں میاں نواز شریف کی حکومت تھی وہ لانا چاہتی تھی مگر قانوناً مرکزی حکومت کے تعاون اور اجازت کے بغیر نہیں لا سکتی تھی۔ البتہ میاں نواز شریف نے وعدہ کیا تھا کہ اگر مسلم لیگ برسر اقتدار آئی تو وہ ان محصورین کو لے آئے گی اور پنجاب میں ان کو آباد کرائے گی۔

پھر ایک سال بعد پی۔ پی۔ پی کی حکومت ختم ہوئی اور مسلم لیگ کو حکومت ملی' کمیٹی نے نواز شریف صاحب کو وعدہ یاد دلایا تو پہلی کھیپ 350 افراد پر مشتمل پنجاب لائی گئی اور میاں چنوں میں آباد کر دی گئی۔ اس میں ہر فرد کو حکومت نے میاں چنوں کے باہر ایک مکان اور تین ایکڑ زمین دی تاکہ وہ کھیتی باڑی کر سکیں آج بھی وہ لوگ وہاں آباد ہیں۔

پھر اس وقت کے وزیر اعلیٰ جناب غلام حیدر وائن صاحب ہی کی کوشش سے 500 مکانات اور بنائے گئے تاکہ مزید پانچ سو خاندانوں کو لایا جا سکے مگر افسوس غلام حیدر وائن صاحب کو قتل کر دیا گیا اور وہ منصوبہ سرد خانے میں چلا گیا۔ اگر وائن صاحب زندہ ہوتے تو یقیناً یہ محصورین جن کی تعداد اب ڈیڑھ لاکھ رہ گئی تھی وہ بھی واپس آ جاتے۔ جناب نواز شریف کی حکومت کے آخری دور میں ایک مرتبہ پھر ان محصورین کو لانے کی کوشش کی گئی اور میاں صاحب نے ارشد چوہدری صاحب کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ معتمر عالم اسلامی کے تعاون سے ان محصورین کو لا کر پنجاب کے 52 اضلاع میں آباد کریں اور ان پانچ سو مکانات کو دوبارہ ٹھیک ٹھاک کرا کے انہی لوگوں کو بسایا جائے میری اور کمیٹی کے اراکین کی دو تین ملاقاتیں ہوئیں اور اس میں خاموشی سے کافی پیش رفت بھی ہوئی تھی کہ ایک مرتبہ پھر نواز شریف حکومت ختم ہو گئی۔ گویا کہ تین مرتبہ مسلم لیگ کی حکومت آئی اور چلی گئی اور دو مرتبہ پی۔ پی۔ پی کی حکومت آئی اور چلی گئی مگر بیچارے محصور پاکستانی آج بھی انہی کیمپوں میں غیر انسانی اذیت ناک زندگی بسر کر رہے ہیں ایک نسل ختم ہو چکی ہے دوسری نسل انہی کیمپوں میں جوان ہو کر پاکستان جانے کی آس لگائے بیٹھی ہے مگر پاکستان ان کو لانا نہیں چاہتا۔ بنگلہ دیش ان کو رکھنا نہیں چاہتا۔ دیگر N.G.O تنظیمیں ان سے منہ موڑ چکی ہیں۔ البتہ کرسچین تنظیمیں ان کے پیچھے پڑی ہیں کہ اگر وہ مسلمان سے

عیسائی بن جائیں تو وہ ان کو کسی بھی عیسائی ملک میں آباد کرنے کے لیے تیار ہیں چند سال قبل میں جب بنگلہ دیش گیا تھا تو میں نے ان کیمپوں کا بھی دورہ کیا تھا۔ جن حالات میں وہ رہ رہے ہیں انسان تو دور کی بات ہمارے پالتو جانور بھی اس سے بہتر حالات میں رہتے ہیں۔ دو وقت کی روٹی بھی ان کو میسر نہیں ہے مگر پاکستان کا جھنڈا آج بھی ان کے ہر کیمپ میں لہراتا ہے اور ہر سال وہ 14 اگست کو اکٹھے ہو کر پاکستان کا ترانہ گاتے ہیں۔ پاکستان کی محبت ان کے دلوں سے آج تک کم نہیں ہوئی ہے۔

میری موجودہ فوجی حکومت سے اپیل ہے کہ وہ اس انسانی اور پاکستانی مسئلہ پر فوری توجہ دیں۔ ارشد چوہدری صاحب کے پاس ان کی مفت آبادکاری کا بندوبست ہے۔ معتمر عالم اسلامی کا فنڈ حبیب بنک اسلام آباد برانچ میں بیس برس سے پڑا ہے۔ پانچ سو مکانات میاں چنوں میں اپنے مکینوں کا انتظار کر رہے ہیں بقایا پنجاب کے 52 ضلعوں میں زمینیں مختص کی جا چکی ہیں۔ ہم کب تک ان کو پاکستان اور افواج پاکستان کا ساتھ دینے کی سزا دیتے رہیں گے۔ یہ پاکستانی کی دھرتی پر بوجھ ہرگز نہیں بنیں گے یہ ہنرمند اور غیرت مند پاکستانی ہیں۔ ہم سے زیادہ پاکستان کے شیدائی ہیں ان کو مزید امتحان میں نہ ڈالو۔ آخر ہم نے لاکھوں افغانی، ایرانی، بھارتی، برمی، سری لنکن، بنگلہ دیشیوں کا بھی تو خواہ مخواہ بوجھ اٹھا رکھا ہے، کیا پاکستان صرف ان ڈیڑھ لاکھ محبِّ وطن پاکستانیوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ لعنت ہے ہم پر کہ ہم اپنے ہی بھائیوں کو بھلا بیٹھے ہیں اور غیروں کو خوش آمدید کہنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔

شادی کے کھانوں پر پابندی ختم ہونی چاہیے

سابق وزیراعظم نے اپنے آخری دور میں آتے ہی یکے بعد دیگرے چند اصلاحات کا اعلان کیا جس میں سرفہرست شادی کے کھانوں پر پابندی تھی۔ اس قانون کے تحت گھروں میں شادی اور ولیمے کے کھانوں پر تو کوئی پابندی نہیں تھی۔ البتہ شادی ہال، ہوٹل، ریسٹورنٹ، پبلک مقامات' سرکاری گارڈن وغیرہ وغیرہ میں شادی ولیمے کا کھانا پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ صرف ٹھنڈے مشروبات' آئسکریم، چائے اور جوس وغیرہ سے تواضع کی اجازت تھی۔ مقصد اس کا غیر ضروری اخراجات اور فضول رسومات کو ختم کر کے سادگی اپنانا بتایا گیا اور یہ دعوی کیا گیا کہ غریب گھرانوں کو مالی بوجھ سے نجات مل سکے گی بظاہر یہ پابندی واقعی بہت اچھی تھی اور عوام کے مفاد میں بھی تھی اس کو شروع شروع میں کافی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ مگر شادی ہالوں اور ہوٹلوں کے مالکان نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ کسی طرح کھانوں پر مکمل پابندی لگانے کے بجائے صرف ایک سالن اور چاول ایک میٹھا کھلانے کی اجازت دے دی جائے مگر نواز شریف صاحب نے ایسی تمام کوششوں کو مسترد کر کے پابندی برقرار رکھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابتدائی دنوں میں تو واقعی کھانوں پر مکمل پابندی پر عمل بھی ہوا مگر آہستہ آہستہ لوگوں نے مختلف رسومات کی آڑ میں کھانے کھلانے شروع کر دیئے۔ مثلاً عقیقہ، ختم قرآن، میلاد، بزنس ڈنر، حج کی واپسی، رسم حنا، وغیرہ وغیرہ کے کارڈ چھپوا کر علاقہ مجسٹریٹ سے اجازت نامہ حاصل کر کے اس کا راستہ نکال لیا جواب کھلے عام ہر کلب۔ ریسٹورنٹ اور بعض ہوٹلوں میں جاری ہے اور دن بدن اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے علاقہ پولیس کلبوں اور شادی ہالوں کے مالکوں سے مل کر چشم پوشی کر رہی ہے اور رات گئے تک شادی ہالوں کے باہر سجی سجائی دولہا کی گاڑی کھڑی رہتی ہے اور اندر باقاعدہ کھانا کھلایا جا رہا ہوتا ہے اور پولیس موبائل میں سوار ہمارے قانون کے محافظ رشوت کے علاوہ نہ صرف کھانا کھاتے ہیں بلکہ پیک کروا کر اپنے تھانے کے دیگر ساتھیوں کے لیے بھی لے جاتے ہیں۔ یہ رشوت علاقہ تھانہ فی دعوت تین سے پانچ ہزار

روپیہ روزانہ کلب اور شادی ہالوں سے وصول کر کے متعلقہ اداروں میں تقسیم کر کے ثواب کمار ہے ہیں۔ کیونکہ ولیمہ سنت ہے اور حکومت نے چونکہ سنت پر پابندی لگا رکھی ہے لہٰذا وہ اس سنت کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

شادی اور ولیمے کے کھانوں پر پابندی لگنے سے کئی فوائد حاصل ہوئے تھے مثلاً تقریبات میں لوگوں کی تعداد کم ہونے لگی تھی۔ دلہن جلدی وداع ہو جاتی تھی۔ کھانے کے اخراجات بچ گئے تھے۔ خواتین نے زیورات اور کپڑوں کی خریداری کافی حد تک کم کر دی تھی کاسمیٹک کا استعمال بھی کم ہو گیا تھا۔ ادھر آئے ادھر نکاح ہوا اور چلو ٹھنڈا پیو اور گھروں کو جاؤ۔ مگر اب دوبارہ چونکہ کھانوں کی پابندی قانون کے محافظوں کی وجہ سے نرم ہوتی جا رہی ہے لہٰذا فضول رسومات پھر سے شروع ہو گئیں۔ وزیر اعلیٰ پنجاب شہباز شریف صاحب نے البتہ اپنے علاقے میں آخری دن تک سختی برقرار رکھی اور ان کے ڈر سے پولیس نے اس قانون پر عمل جاری رکھا دیگر صوبوں میں جزوی طور پر عمل ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں میری تجویز یہ ہے کہ یا تو مکمل پابندی ہو اور اس پر عملدرآمد کو بھی یقینی بنایا جائے۔ یا یہ پابندی اٹھا ہی لی جائے کیونکہ اگر کوئی غریب کھانا نہیں کھلاتا تو یار دوست لڑکی والوں کو طعنہ دیتے ہیں کہ وہ کترا کر پیسے بچا رہا ہے اگر کوئی امیر نہیں کھلاتا تو لوگ کہتے ہیں کہ بھئی اتنے امیر ہوتے ہوئے جناب واقعی بڑے سادہ اور قانون کا احترام کرنے والے ہیں سبحان اللہ! ان کو کسی کی کیا مجال کہ یہ کہے کہ اتنے امیر ہوتے ہوئے کنجوسی کر رہے ہیں۔ گویا دونوں صورتوں میں غریب پر ہی عتاب آتا ہے، اگر پابندی رکھنا ہے تو صرف مساجد یا کمیونٹی ہال میں سادگی سے نکاح کروا کر بے شک شادی ہالوں یا اپنے اپنے گھروں سے رخصتی ہونی چاہیے کسی بھی شخص کو اپنے گھر میں نہ کسی ہوٹل یا شادی ہال میں کھانے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے اور جو بھی اس قانون کی خلاف ورزی کرے اس سے سختی سے نمٹنا چاہیے۔ کیونکہ اس اصلاح کا فائدہ غریب اور متوسط طبقہ کے لیے تھا نہ کہ امیروں، جاگیرداروں کے لیے جگ ہنسائی غریبوں کا حصہ بن گئی اور امیروں نے تو اپنے بڑے بڑے لانوں میں یا شادی ہالوں میں کھانا کھلا کر اس اسکیم کو ناکام بنا دیا۔

اگر ہم اس پابندی کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ پابندی جب زوروں پر تھی تب سے آج تک گوشت، آٹا، چینی کے داموں میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اور جزوی طور پر اس عمل سے رشوت کا بازار الگ کھل گیا۔ تو ایسی پابندی سے کیا فائدہ جس سے نہ تو دام گریں اور نہ لوگ عمل کے لیے تیار ہوں اس سے بہتر ہے کہ پابندی فوری طور پر اٹھا لی جائے۔ کیونکہ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے شادی ہالوں میں کھلے عام کھانے کھلائے جا رہے ہیں۔ اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو چند ماہ بعد ہوٹلوں میں بھی دیگر بہانوں سے

کھانے کھلانے کی تیاری شروع ہو جائیگی تو کیوں نہ ہم اس پابندی کو ختم کر دیں۔ ویسے بھی اسلام میں شادی بیاہ اور ولیمے کے موقع پر حسب حیثیت کھانا کھلانا مسنون بھی ہے اور ضرورت بھی۔ نہ جانے نواز شریف حکومت نے اس پابندی ختم کیوں نہیں کیا موجودہ حکومت اس کو ختم کر کے کریڈیٹ لے سکتی ہے۔ کیونکہ یہ ناقابل عمل اسکیم تھی جس سے کسی کو فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے اور اس سے منسلک کافی کاروبار آج بھی متاثر ہیں۔

لو وہ آ رہے ہیں

آخر کار بھارتی کوششیں ناکام ہوئیں اور واشنگٹن سے صدر کلنٹن کے موجودہ بھارت اور بنگلہ دیش کے دورے میں پاکستان کو بھی شامل کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ وہ تمام حکومتی اور سفارتی کوششیں جو پچھلے چند ہفتوں سے بھارت کے موجودہ متعصب حکمرانوں نے دن رات ایک کر کے صدر کلنٹن کو پاکستان جانے سے روکنے کے لئے عالمی سطح پر کی تھیں' دم توڑ گئیں۔ جو نام نہاد جھوٹا پروپیگنڈا بھارتی ذرائع ابلاغ نے پاکستان کے خلاف شروع کر رکھا تھا' اپنے منطقی انجام کو پہنچا۔ اس کا کریڈیٹ امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کو جاتا ہے جنہوں نے اپنی مثبت کوششوں سے امریکی سینیٹروں کو قائل کرنے کے لئے دن رات صرف کر کے یہ ثابت کر دکھایا کہ صدر کلنٹن کا دورہ پاکستان صرف پاکستانیوں کے حق میں نہیں بلکہ امریکیوں کے حق میں زیادہ ہے کیونکہ برصغیر میں صرف ایک مسئلہ ہے جو 52 سال سے بھارت کی ہٹ دھرمی کا شکار ہے۔ وہ ہے مسئلہ کشمیر۔ اگر صدر امریکہ صرف بھارت کا دورہ کر کے واپس اپنے ملک آئیں گے تو ان سے یہ ضرور پوچھا جائے گا کہ مسئلہ کشمیر حل ہو گیا؟ یا اس کے لئے کیا کوششیں کی گئیں؟ تو اس کا وہ پاکستان جائے بغیر کوئی جواب نہیں دے سکیں گے۔ اس مسئلہ کشمیر کی وجہ سے برصغیر کا امن ہمیشہ خطرے میں رہے گا اور پوری دنیا اس سے واقف ہے کہ جب تک بھارت اور پاکستان مل کر امن مسئلہ کو حل نہیں کریں گے۔ برصغیر کا امن قائم نہیں ہو سکے گا اور اب جبکہ دنیا سکڑ کر چھوٹی ہو چکی ہے۔ اگر برصغیر کو کچھ ہوا تو دوسرے براعظم بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ دوسرے معنوں میں پوری دنیا کا امن بھی متاثر ہوگا۔ لہٰذا قیام امن کی کوششوں کے لئے امریکہ صدر کا دورۂ پاکستان کشمیر کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ایک مثبت اقدام تصور ہوگا اگرچہ اس کے لئے صرف ایک دن کا وقت قطعی ناکافی ہے اور صدر امریکہ کے اقتدار کا دورانیہ بھی اب اختتام پذیر ہے اگر صدر کلنٹن اس مسئلہ کو حل کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو امریکی تاریخ میں ان کا نام امر ہو جائے گا اور وہ امریکی صدور میں سب سے نمایاں

صدر کہلائیں گے اگر اس مسئلہ کو وہ حل نہ کر پائیں تو کم از کم حل کی جانب مثبت اقدام ہی کر جائیں۔ امریکہ نے قیام امن کے لئے ہمیشہ مثبت کوششیں کیں۔ مثلاً آج فلسطین کا مسئلہ کافی حد تک حل ہو چکا ہے یہودی اور مسلمان دونوں کو امریکہ ہی نے ایک ٹیبل پر بٹھا کر اس کو حل کرنے کی پہل کی تھی۔ ہم کو چاہئے کہ اب ہم خود امریکی صدر سے کہیں کہ آپ اس مسئلہ کا حل بتائیں تاکہ کم از کم ہمیں ان کی نیت اور ارادوں سے آگاہی ہو۔ بھارت کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے برطانیہ کے آخری وائسرائے کا بویا ہوا بیج مسئلہ کشمیر اگر امریکی صدر کی ثالثی میں حل ہو جائے تو اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ باہمی دشمنی سے نہ بھارت کے عوام کو فائدہ ہے اور نہ ہی پاکستان کے عوام کو کوئی فائدہ ہوگا۔ البتہ جب تک ہم ایک دوسرے کے دشمن بنے رہیں گے اپنے عوام کو جہالت' غربت' بے روزگاری اور نفرت کے سوا کچھ نہیں دے سکیں گے۔ دنیا ترقی کر کے کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔ مگر ہم کو ایک دوسرے کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ ہمیں سوچنا چاہئے اربوں کھربوں ڈالر کا اسلحہ تباہ کر کے ہمیں آج تک کیا ملا۔ لاکھوں جانیں گنوا کر کیا مسئلہ حل ہوا۔ ہم اچھے پڑوسی ہونے کے بجائے اپنی تمام توانائیاں منفی اقدامات کی نذر کر کے کس کا بھلا کر رہے ہیں۔ دو بڑی ہولناک جنگوں اور ہزاروں جھڑپوں نے ہمیں کیا دیا ہے۔ آج نہیں تو کل اس کا حل ضرور نکلے گا کیونکہ دنیا یہ بات باور کر چکی ہے کہ جنگ مسئلہ کا حل نہیں ہوتی۔ پہلے بے شک مسئلہ کے حل میدان جنگ میں ہوا کرتے تھے۔ آج کسی چھوٹے سے چھوٹے ملک پر بھی دوسرا ملک مسلط نہیں ہو سکتا۔ افغانستان اور چیچنیا اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ خود بھارت 52 سال سے اپنے مقبوضہ کشمیر کے عوام کو مراعات دے دے کر بھی اپنا نہیں سکا۔ چند غداروں کے سوا' کشمیریوں نے کبھی بھارت سے رشتہ جوڑنے کی بات نہیں کی۔ ظلم کے بل بوتے پر ہی بھارتی فوج آج تک قابض ہے اور یو این او (U.N.O.) اور عالمی طاقتوں مصلحت آمیز خاموشی سے بھارت کو شہ ملتی رہی ہیمگر کشمیریوں کی جدوجہد ایک دن ضرور رنگ لائے گی۔ 52 سال سے کشمیریوں کا جو خون بہہ رہا ہے اس سے آزادی کی شمع ضرور فروزاں ہوگی۔ روس جیسی سپر پاور ایک رات میں بکھر سکتی ہے تو بھارت روس سے بڑی طاقت تو نہیں۔ درجنوں اقوام سو کے قریب بولیاں بولنے والے لوگوں پر مشتمل یہ ملک' جس میں ہندو' اچھوت' مسلمان' پارسی' یہودی' عیسائی' سکھ' زرتشت' بدھسٹ' سیکولر سب ہی رہتے ہیں جن کی تہذیب وتمدن و رسم ورواج کھانا پینا تک ایک دوسرے سے مختلف ہے اس کے ٹوٹ کر بکھرنے میں کتنا وقت لگے گا۔ بھارت میں سیکولرزم کے دعوے کے باوجود آج تک کوئی مسلمان یا سکھ وزیراعظم نہ بن سکا ہے نہ سوا اگلے سال تک ہندو کے سوا کوئی وزیراعظم ہوگا۔ صرف انگوٹھا چھاپ صدر ضرور غیر مذاہب سے آتا رہے گا۔

ہندو مسلمان دشمنی کی زندہ مثال کرکٹ کو ہی لے لیجئے ۔ ورلڈ کپ کے موقع پر کرکٹ ہمارا مذہب اور ٹنڈولکر ہمارا خدا ہے کے نعرے سے کون واقف نہیں ہے جو بھارتی میڈیا سے دن رات دہرایا جارہا تھا۔ مگر خدا نے اس بت کو پاش پاش کر دکھایا اور بھارت ورلڈ کپ کے سیمی فائنل میں بھی نہیں آسکا۔ مسلمان دشمنی کی بناء پر اظہر الدین کو بہترین بلے باز ہونے کے باوجود ایک سال تک باہر بٹھا دینا کپل دیو اور ٹنڈولکر کی ہٹ دھرمی اور مسلمان دشمنی نہیں تو پھر اور کیا ہے ۔ ہم کو امریکی صدر بل کلنٹن کے موجودہ دورے سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہئے ۔ جنرل پرویز مشرف صاحب کو میرا مشورہ ہے کہ وہ فوری طور پر سی ٹی بی ٹی کی توثیق بھارت سے مشروط کر کے پہل کر دکھائیں ۔ دستخط تو ایک نہ ایک دن سب ہی کو کرنا ہوں گے ۔ بہتر ہے کہ ہم یہ پہل کر کے دنیا پر ثابت کر دیں کہ ہمیں ایٹمی پروگرام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ۔ ہم نے ایٹمی دھماکہ صرف بھارت کے دباؤ کی روک تھام کے لئے کیا تھا۔ ہم امن پسند مسلمان ہیں جب بھی کوئی ہم پر جنگ مسلط کرے گا ہم اپنے دفاع کے لئے ہی ایٹمی طاقت سے مقابلہ کریں گے ۔ سی ٹی بی ٹی پر مشروط دستخط کا صدر کلنٹن پر مثبت اثر مرتب ہوگا۔ اور امریکیوں کے لئے باعث سکون ۔ اس سے ہمارے بھاری قرضے بھی معاف ہو جائیں گے ۔ اور بھارت کا انکار خود اس کے جارحیت پسند ہونے کا ثبوت ہوگا اور امریکیوں کے لئے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ پاکستان ہرگز دہشت گرد نہیں مظلوم ملک ہے جسے بھارت اپنی طاقت کے بل بوتے پر ڈرا دھمکا کر رکھنا چاہتا ہے اور وہ مسئلہ کشمیر کے حل میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اگر ہم نے اس دورہ سے یہ ثابت کر دکھایا تو یقیناً یہ ہماری سفارتی سطح پر عالمی برادری کے سامنے بہت بڑی فتح ہے جو ہم صرف ایک دن میں حاصل کر سکتے ہیں اور بھارت اپنی طاقت کے گھمنڈ میں چھ دن میں بھی حاصل نہیں کر سکے گا ہمیں دہشت گرد کہنے اور کہلوانے والا بھارت خود بے نقاب ہو جائے گا اور عالمی برادری بھارت کا اصلی چہرہ دیکھ سکے گی۔

دو الفاظ ''تیس ارب''

چند دن پہلے اخبارات کی سرخی تھی کہ نواز شریف' بے نظیر اور جونیجو دور میں تیس ارب روپے کے قرضے معاف کئے گئے ۔ جس میں 75 فیصد قرضے صرف ہمارے 75 فیصد مینڈیٹ رکھنے والے قائد نواز شریف کے ادوار میں معاف کئے گئے ۔ ان تینوں وزراء اعظم میں صرف ایک بات مشترک تھی وہ یہ کہ ان تینوں وزراء اعظم کو معزول کر کے گھروں کو بھیج دیا گیا۔

بظاہر ''تیس ارب'' دو الفاظ کا مجموعہ ہے مگر ہم غور کریں تو ''تیس ارب'' روپے اگر ہم صرف تعلیم پر خرچ کرتے تو آج ہماری قوم جہالت سے نکل کر ترقی کی راہ پر لگ چکی ہوتی ۔ ہمارے بچے جاہل اور گنوار معاشرے سے نکل کر تعلیم یافتہ قوموں میں شامل ہو جاتے ۔ افسوس صد افسوس تین دن اس خبر کو گزر جانے کے بعد بھی کسی سمت سے اس کے خلاف کوئی احتجاج بلند نہیں ہوا۔ کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ ان تینوں وزرائے اعظم کو یہ حق کس نے دیا تھا کہ قوم کے خون پسینے کی کمائی کے ''تیس ارب'' روپے اپنے اپنے پیاروں کو معاف کر دیں ۔ اس قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ خود اپنی گاڑھے پسینے کی کمائی دن دہاڑے لٹتے دیکھ کر بھی اس کے خلاف احتجاج تک نہیں کر رہی ہے ۔ آیئے میں آپ کو سنگاپور میں ہونے والے دو واقعات بتاؤں ۔ چند سال پہلے ایک بہت بڑی کمپنی دیوالیہ ہو گئی ۔ اس نے بینک سے بہت بھاری قرضہ لیا ہوا تھا۔ کمپنی کے بورڈ آف ڈائکٹرز نے بینک کو لکھا کہ جناب ہم قرضے میں ڈوب گئے ہیں ۔ ہم کو کروڑوں کا نقصان ہو گیا ہے اور ماضی میں ہم نے آپ سے جتنے بھی قرضے لئے ہمیشہ وقت پر مع سود ادا کر دیئے ۔ اب ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ آپ کا قرضہ اور سود ادا کر سکیں ۔ براہ مہربانی ہمارا پرانا قرضہ معاف کر دیا جائے اور سود بھی چھوڑ دیا جائے اور کاروبار کے لئے نیا قرضہ جاری کر دیا جائے ۔ بینک کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کا اجلاس ہوا۔ بورڈ نے اس کمپنی کی ماضی کی فائل کا جائزہ لیا اور تحقیقات کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ یہ ایک حقیقی (Genuine) کیس ہے اور کمپنی ناگہانی

صورت حال کی وجہ سے دیوالیہ ہوگئی ہے لہذا اس کا قرضہ معاف کر کے نیا قرضہ جاری کر دیا جائے تا کہ اس کمپنی کی ساکھ بحال ہو سکے۔ اس طرح انہوں نے بینک کا قرضہ مع سود معاف کر دیا اور نیا قرضہ بھی جاری کر دیا۔ سال کے آخر میں جب حکومت کو پتا چلا کہ بینک نے قرضہ اور سود معاف کر دیا ہے تو انکم ٹیکس والوں نے نوٹس دیا کہ آپ نے بینک کا قرضہ اور سود معاف کر دیا۔ جس کی وجہ سے حکومت کو اتنا نقصان ہوا۔ اس رقم اور سود پر اتنا انکم ٹیکس حکومت کو ملتا تھا۔ براہ مہربانی فوراً اتنا انکم ٹیکس جمع کرا دیں جو قوم کی امانت ہے۔ بینک والوں نے بہت شور مچایا مگر آخر کار ان کو مطلوبہ انکم ٹیکس ادا کرنا پڑا۔ کیونکہ حکومت کا کہنا تھا اول تو یہ پیسہ قوم کا تھا۔ آپ کی نا اہلیت کی وجہ سے ڈوبا تو اس کی سزا قوم کو کیوں دی جائے۔ کیوں نہ آپ کا بینک بند کر دیا جائے یا پھر اس رقم کا انکم ٹیکس کیوں ڈوبے۔ یاد رہے سنگاپور میں انکم ٹیکس کی شرح صرف 15 فیصد ہے اور وہ رقبہ اور آبادی دونوں کے لحاظ سے کراچی سے بھی چھوٹا ہے اور جیسا میں نے لکھا انکم ٹیکس صرف 15 فیصد ہے مگر دنیا کی بڑی سے بڑی کمپنی کا دفتر اس چھوٹے سے ملک میں موجود ہے اور اس کا بجٹ ہم سے سو گنا زیادہ ہے۔ ہم اگر کھربوں روپے ٹیکس کے وصول کر رہے ہیں تو وہ کھربوں ڈالر وصول کر کے اپنی قوم کو آج دنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں شامل کر چکے ہیں۔

ایسا ہی ایک اور دوسرا واقعہ بھی بینک سے متعلق ہے۔ وہ یہ کہ ایک بینک کے افسر نے ایک تجارتی کمپنی سے مل کر فراڈ کیا۔ سال کے آخر میں بینک کے بڑے افسران کو معلوم ہوا کہ ہمارے کسی افسر نے مل کر فراڈ کیا تو انہوں نے اس افسر اور تجارتی کمپنی پر دباؤ ڈالا کہ وہ فوراً بینک کو مطلوبہ رقم فراہم کریں۔ ورنہ پولیس کارروائی کرے گی۔ اس افسر نے کمپنی پر زور ڈالا کہ اگر اس نے پیسے واپس نہ کئے تو اس کی نہ صرف نوکری چلی جائے گی بلکہ پولیس کارروائی بھی ہوگی۔ چنانچہ دونوں نے اپنے اپنے حصے کی رقم بینک میں جمع کرا دی۔ پولیس کو کسی نے اطلاع دی۔ باوجود اس کے کہ بینک والوں کو رقم واپس مل چکی تھی۔ پولیس نے مداخلت کر کے بینک افسر اس تجارتی کمپنی اور بینک کے بورڈ کے خلاف مقدمہ درج کر دیا کہ وہ کون ہوتے ہیں جو اس غبن کو حکومت سے چھپائیں۔ ان کو چاہیئے تھا کہ وہ رقم وصول کر کے بھی پولیس کو مطلع کرتے تا کہ اس جرم کی سزا مجرموں کو ملتی۔ اس طرح انہوں نے مجرموں کی پردہ پوشی کی اور بعد میں عدالت نے تینوں کو سزا دی کیونکہ جرم کی پردہ پوشی بھی جرم ہے۔ یہ ہے اس چھوٹے سے ملک میں قانون کی حکمرانی کا حال۔ جہاں اب کوئی بھی شخص کھلے عام سگریٹ نہیں پی سکتا۔ کوئی چیونگم نہ بیچ سکتا ہے اور نہ کھا سکتا ہے جہاں چرس' افیون' ہیروئن بیچنے پر یقینا سزائے موت سے اس سے کوئی نہیں بچ سکتا جہاں آپ کو پولیس کی وردی میں شاذ و نادر ہی کوئی نظر آئے گا مگر قانون کی حکمرانی

اس درجہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک امریکی نابالغ نے کوئی جرم کیا۔ امریکی حکومت نے پورا زور لگا لیا کہ اس نابالغ کو سزا نہ ملے مگر انہوں نے امریکی حکومت کی پرواہ نہ کی اور مجرم امریکی کو سزا کے بعد ملک بدر بھی کر دیا۔

پچھلے سال حج کے موقع پر میں جس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا اس ہوٹل میں تقریباً پانچ سو افراد کا ایک قافلہ بھی ٹھہرا تھا۔ ہر نماز کے بعد جب میں واپس آتا تھا تو یہ دیکھ کر تعجب کرتا تھا کہ کھانے کے وقت عورتیں' بچے' بوڑھے سب لائن میں لگ کر خاموشی سے کھانا لیتے تھے اور اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ کر خاموشی سے کھانا کھاتے تھے۔ میں نے ان کے کنٹریکٹر سے پوچھا کہ انہوں نے حج اور ہوٹل کی سہولیات میں فی کس کتنے پیسے لئے ہیں تو اس نے بتایا کہ اس نے ہر حاجی سے آنے جانے کا ٹکٹ' کھانا پینا اور تمام سہولیات فراہم کرنے کے لئے تقریباً اتنے ہی پیسے لئے ہیں جو ہماری حکومت نے آنے جانے اور ٹھہرنے کے لئے ہماری قوم سے وصول کئے جس میں کھانا بھی شامل نہیں تھا اور سنگاپور کی فلائیٹ کا ٹائم بھی ہم سے چار گھنٹے زیادہ تھا اور سنگاپور نے ہم سے بھی کم داموں پر ان حاجیوں کے لانے اور لے جانے کے لئے باضابطہ ایک محکمہ بنایا ہوا ہے جو اس بات پر بھی نظر رکھتا ہے کہ حج اس کے باشندے پر بھاری نہ پڑے اور اسی کنٹریکٹر نے یہ بھی بتایا کہ جب اس نے ان حاجیوں کو لانے لے جانے۔ ٹھہرنے اور کھانے کا بندوبست کیا تو سنگاپور کی حکومت نے اس سے لکھوا لیا کہ وہ کیا کیا سہولتیں فراہم کرے گا اور واپسی پر اس کا زرضمانت اسی وقت واپس ہوگا جب یہ تمام حاجی واپس سنگاپور آئیں گے اور ہر ایک اس فارم پر لکھ کر دے گا کہ اس کا حج اطمینان بخش اور کھانا اور رہنا اس فارم پر لکھے ہوئے وعدوں کے مطابق فراہم کیا گیا تھا۔ اگر کسی نے بھی شکایت کی اور وہ ثابت ہوگئی کہ ان شرائط کو پورا نہیں کیا گیا تو نہ صرف اس ٹریول ایجنسی کا لائسنس منسوخ ہوگا بلکہ اس کا زرضمانت ان حاجیوں میں تقسیم کر کے سزا بھی دی جائے گی۔

ہے کوئی جو ان وزرائے اعظم سے تیس ارب روپے کا کم از کم انکم ٹیکس وصول کر کے دکھائے۔ ایک وزیراعظم تو اب دنیا میں نہیں رہے مگر ان کی جائیدادیں اور لواحقین تو موجود ہیں جو اب بھی سیاست میں اپنی دکان چمکانے میں مصروف ہیں۔ ہے کوئی جو دو الفاظ یعنی ''تیس ارب'' روپے وصول کرنے میں پہل کرے تا کہ آنے والے حکمراں قوم کے خون پسینے کی کمائی دن دہاڑے نہ لوٹ سکیں؟ مگر کوئی یہ کام کرے یا نہ کرے' اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ ذرا اللہ کی گرفت تو دیکھو۔ ایک اس دنیا میں نہیں رہا۔ دوسرا جلاوطن زندگی گزار رہا ہے اور تیسرا جیل میں اپنی قسمت کے فیصلے کا منتظر ہے یہی قرآن کہتا ہے ''ناعتبروا یا اولی الابصارہ'' یعنی اے آنکھوں والو عبرت پکڑو۔

آئے بھی وہ، گئے بھی وہ

بڑی کوششوں اور جدوجہد کے بعد امریکی صدر بل کلنٹن آخرکار پاکستان آ ہی گئے۔ وہ صرف 6 گھنٹے 56 منٹ 55 سیکنڈ سرزمین پاکستان پر ٹھہرے۔ ان کے اس دورے کے دوران صرف 2 منٹ ضائع ہوگئے جوانہوں نے صدر پاکستان کی آمد میں تاخیر کی وجہ سے انتظار میں گزارے۔ انہوں نے قوم سے بھی خطاب کیا۔ وضاحتیں، نصیحتیں۔ کچھ دوستی کے حقوق اور دشمنی کے نقصانات سے آگاہ کیا۔ ڈائریکٹ مذاکرات کئے۔ ساتھ لائے ہوئے اپنے کھانے کھائے تاکہ نمک حلالی نہ کرنی پڑے۔ سرزمین ہماری تھی۔ سیکوریٹی ان کی تھی۔ ٹیبل ہماری تھی۔ کھانا پانی ان کا تھا۔ مسئلہ ہمارا تھا۔ ایجنڈا ان کا تھا۔ دراصل ہم نے ان کی آمد کو ہی اپنی فتح سمجھ لیا تھا۔ باوجود بھارت کے بار بار اعلان کے ہم کسی کی ثالثی کشمیر پر ہرگز تسلیم نہیں کریں گے۔ ہم نے مسئلہ کشمیر سے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ ہم نے اس قرآنی انتباہ کو بھی بھلا دیا تھا کہ اے مسلمانو! یہ یہود اور نصاریٰ ہرگز تمہارے دوست نہیں ہوسکتے۔ ہم نے اسی دوستی کی آڑ میں ان کی جنگ دل کھول کر افغانستان میں لڑی۔ جب مطلب نکل گیا تو کیسا پاکستان، کون اسامہ بن لادن۔ ہم یہ سمجھ بیٹھے تھے۔ ادھر صدر کلنٹن آئیں گے۔ وہ بھارت کو سمجھائیں گے۔ جیسا انہوں نے اسرائیل اور عربوں کو ایک ٹیبل پر بٹھا کر فلسطین کا مسئلہ حل کروایا اسی طرح بھارت اور پاکستان کو ایک ٹیبل پر بٹھا کر کہیں گے چلو اس مسئلہ کو حل کرو۔ مگر انہوں نے بھارت کو نہ سمجھایا، نہ دھمکایا۔ بس اتنا کہا کہ جنگ مسئلہ کا حل نہیں ہوتی۔ البتہ پاکستان سے وہ کچھ نالاں سے رہے۔ اس وقت مجھے ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے کہ ایک میراثی کا بیٹا شہر جا کر کافی پڑھ لکھ کر بڑی بڑی ڈگریاں لے آیا۔ جب واپس شہر سے گاؤں لوٹا تو اس کو گاؤں کے چوہدری کی بیٹی پسند آ گئی۔ اس نے باپ سے کہا میرا رشتہ چوہدری صاحب کی بیٹی سے کروا دو۔ باپ نے بہت سمجھایا کہ کہاں ہم کہاں چوہدری۔ بے شک تو کافی پڑھا لکھا ہے مگر وہ چوہدری ہیں۔ بھول جا اس رشتہ کو ہم اپنی ہی برادری میں رشتہ کروا دیں گے۔ مگر وہ نہ مانا۔

آخر ایک دن وہ خود چوہدری صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ چند مہمان اور چوہدری کے آدمی بیٹھے تھے۔ چوہدری صاحب نے آنے کا سبب پوچھا۔ کہنے لگا یہ لوگ فارغ ہو جائیں۔ میں اکیلے میں بات کروں گا۔ چوہدری نے کہا کہ یہ سب لوگ اپنے ہی سمجھو بتاؤ کیا بات کرنی ہے۔ پہلے تو وہ ٹالتا رہا مگر جب چوہدری نے زور دے کر کہا کہ بتاؤ کیا بات کرنی ہے تو اس نے ڈرتے ڈرتے مدعا بیان کیا۔ یہ سننا تھا کہ چوہدری نے لال پیلا ہو کر اپنے آدمیوں کو کہا کہ اس کو بتاؤ کہ رشتہ کیسے مانگا جاتا ہے۔ چوہدری کے آدمی اس میراثی کے بیٹے پر پل پڑے اور لاتوں، مکوں کی بارش کر دی۔ کافی دھنائی ہوگئی تو وہ کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا اور کہا "اچھا چوہدری صاحب میں چلتا ہوں۔ تو کیا آپ کی طرف سے ناں ہی سمجھوں۔" یہی حال ہمارا ہے کہ ہر دو بڑوں سے جن کے مفادات ایک جیسے ہیں۔ ہم مسئلہ کشمیر حل کروانے چلے ہیں۔ یہ اسی سردار جی کی طرح کی حماقت ہوگی کہ ریلوے اسٹیشن پر کھڑے قہقہے لگا رہے تھے۔ کسی نے پوچھا سردار جی کیوں اتنا ہنس رہے ہو۔ کہنے لگے میں نے ریٹرن ٹکٹ لیا ہوا ہے اور جانا میں نے ہے نہیں۔ ٹرین تو رکی رہے گی نا۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا۔ بھارت میں چونکہ فیول مہنگا ہے اس لئے پاکستان میں وہ فیول بھروانے کے لئے رکیں گے۔ جیسا کہ پہلے زمانے میں ہوتا تھا کہ جب لوگ بسوں میں لمبے سفر پر جاتے تھے تو راستہ میں فیول بھروایا جاتا تھا۔ اس دوران مسافر حضرات کھانے وغیرہ سے فارغ ہو جاتے تھے تو کلنٹن کا جہاز جب اسلام آباد اترا تو واقعی دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا چونکہ دورہ آفیشل نہیں تھا۔ لہٰذا گارڈ آف آنر کی ضرورت نہیں تھی۔ چار منٹ میں فارغ ہوگئے اور کھانا ٹھنڈا ہو رہا تھا لہٰذا جلدی جلدی ایوان صدر پہنچے بلکہ وہ دو منٹ پہلے ہی پہنچ گئے تاکہ ہمارے صدر کو انتظار نہ کرنا پڑے کیونکہ انہوں نے تقریر میں کہا تھا کہ میں نے قرآن اور اسلام کا مطالعہ کر رکھا ہے اس لئے وقت کی پابندی انہوں نے اسلام ہی سے سیکھی ہوگی۔

مگر میں کہتا ہوں کہ اگر انہوں نے واقعی قرآن کا مطالعہ اسی کیفیت سے کیا ہوتا جیسا ان کے امریکی شہری باکسر کیسس کلے اور مائیک ٹائیسن نے کیا تھا تو وہ بھی بل کلنٹن کے بجائے محمد علی یا ملک عبدالعزیز بن چکے ہوتے۔ "ابوکلیم" ہوتے ہوسکتا ہے کہ ہمارے پاکستانی دوست کامران کی والدہ نے روانہ ہوتے وقت ان کو قرآنی آیات پڑھ کر پھونکا ہوتا کہ اس کے اثر سے اپنا ہاتھ ہلکا رکھیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے جو ہم نے 26 تحائف ساتھ روانہ کئے ہیں وہ ان سے دل بہلانے کے لئے کافی ہوں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ نواز شریف کی رہائی کی آخری کوشش کے طور پر جنرل مشرف سے "ہاتھ ہولا" رکھنے کے لئے کہنے آئے ہوں گے۔ مگر شاباش ہے ہمارے جنرل کو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ بھارت اور پاکستان کا صرف ایک ہی جھگڑا ہے وہ ہے

کشمیر اور رہا وزیر اعظم نواز شریف کا کیس وہ عدالت فیصلہ کرے گی۔ سی ٹی بی ٹی، قبل از وقت ہے۔ میرے خیال میں اگر جنرل مشرف صاحب یہ کہہ دیں۔ ہم سی ٹی بی ٹی پر دستخط مسئلہ کشمیر سے نتھی کر دیں تو قوم کو یہ فیصلہ قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ اس میں اس خطے میں بسنے والے ہندوستان اور پاکستان کے عوام ہی کا فائدہ نہیں ہے بلکہ عالمی امن کا دارومدار بھی ہے۔ مگر نہ امریکہ اس پر عملی طور پر سنجیدہ ہے اور نہ یو این او۔ اسی وجہ سے ہندوستان بڑی ڈھٹائی سے اس مسئلہ میں کسی کی ثالثی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم ہیں کہ اقوام عالم سے امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہیں کہ وہ ہمارے جھگڑے کو حل کروائیں گی۔ بقول شاعر

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے، وفا کیا ہے

ایک نیا موڑ

اسلامی تاریخ کا ایک ورق پڑھیئے۔ حضرت عمر بن خطابؓ اپنی شہادت سے چند یوم قبل مدینہ منورہ میں صبح کی نماز پڑھانے جا رہے تھے کہ ایک ایرانی کافر غلام نے جوان سے ناراض تھا راستہ میں حضرت عمرؓ سے سخت کلامی کی اور جان سے مارنے کی دھمکی بھی دی۔ صحابہ کرامؓ اور عمر فاروق اعظمؓ کے پروانوں کو یہ بات بری لگی انہوں نے اس غلام کو پکڑا کر سزا دینا چاہی کیونکہ اس نے قتل کی دھمکی دی تھی مگر امیر المومنین حضرت عمرؓ نے ان کو سزا دینے سے روک دیا اور فرمایا: اسلام میں سزا اور جزا عمل کے بعد ہوتی ہیں چونکہ اس نے مجھے ابھی تک کوئی نقصان نہیں پہنچایا صرف دھمکایا ہے۔ لہٰذا اس پر کوئی حد قائم نہیں کی جا سکتی مگر چند یوم بعد اس بد بخت نے حضرت عمرؓ پر قاتلانہ حملہ کر کے شہید کر دیا تو حضرت عمرؓ نے بستر مرگ پر اس غلام کو معاف کر دیا اور قصاص سے بھی منع فرما دیا۔

طیارہ سازش کیس میں جس پر پوری دنیا کی نظریں لگی تھیں، عدالت نے سابق وزیر اعظم نواز شریف کو محرم ثابت ہونے پر دو مرتبہ عمر قید کی سزا سنائی جس کی رو سے وہ 25 سال تک جیل میں رہیں گے اور دیگر ملزمان کو بری کر دیا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا مقدمہ نہیں ہے اس سے پہلے بھی ہمارے ملک میں ضیاء الحق کے دور میں سابق وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کو بھی اسی مہینہ میں سزائے موت دی گئی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ بھٹو صاحب پر قتل کا الزام تھا جس کے مطابق انہوں نے ایف ایس ایف (FSF) کے سربراہ کی موجودگی میں نواب محمد احمد کو قتل کیا تھا مگر اس کیس میں صرف سازش کا عنصر نمایاں تھا کہ جہاز کو اترنے نہیں دیا گیا۔ دونوں کیسوں میں مشترکہ کہ بات یہ ہے کہ ملزم نے خود جرم نہیں کیا تھا اور نہ ہی وقوعہ پر موجود تھا۔ اس وقت پوری دنیا خصوصی طور پر بھارت، امریکہ، برطانیہ کا بالخصوص اور یورپی، ایشیائی ممالک کا بالعموم یہ رویہ رہا ہے کہ نواز شریف کو پھانسی نہیں ہونی چاہیے اس سے ہماری کافی بدنامی پہلے ہی ہو چکی تھی۔ مگر آج کی دنیا میں تو بدنامی

کے ساتھ ساتھ ہم پوری عالمی برادری سے کٹ رہے ہیں ہم پر اقتصادی پابندیاں روز بروز بڑھ رہی ہیں دھمکیوں اور لالچ دونوں ہی طریقے سے ہمیں دبایا جارہا ہے۔ اگر ہم اس کیس کا تجزیہ کریں تو جمعرات کی صبح 9 بجے سے زی ٹی وی نے تو حد کردی اور نواز شریف کے لیے اتنا واویلا مچایا جیسے کہ ہم ان کے وزیراعظم کو سزا دینے والے ہیں میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ انہیں نواز شریف سے اتنی ہمدردی کیوں ہے وہ کیوں ہماری عدالتوں کی کاروائیوں کے فوجی دباؤ کے تحت ہونے کا مذموم الزام لگارہے ہیں جبکہ نواز شریف اور ان کے وکیل نے خود کہا ہے کہ انہیں اس عدالت پر پورا اعتماد ہے اگر وہ کسی شک وشبہ کا اظہار کرتے تو بے شک ان پر جانبداری کا الزام لگ سکتا تھا مگر مدعی سست گواہ چست کے مصداق اس وقت بھارتی پروپیگنڈہ ٹی وی والوں پر صادق آرہا تھا بارہ بجے تک تو صرف پھانسی پھانسی کی رٹ لگائے رکھی، مگر جب عدالت نے عمر قید کی سزا سنائی تو بھی ان کا ردعمل منفی تھا اور ان کے نام نہاد مبصرین اور خود ہمارے ملک کی ایک سنیئر رپورٹران کی ہاں میں ہاں ملارہی تھیں۔

بھارتی مبصرین یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ اسپیڈی کورٹ خود میاں نواز شریف کے مینڈیٹ کی بدولت وجود میں آئی تھیں، جن کے بارے میں قانون قومی اسمبلی سے راتوں رات پاس کرواکر نافذ العمل کر دیا گیا۔ جبکہ ان کے خود حلیف یہ کہتے رہے کہ یہ قانون بلیک میلنگ کے طور پر استعمال ہوگا اور ان کی سب سے بڑی حلیف جماعت ایم کیو ایم نے تو اسمبلی کے اس اجلاس سے عملی طور پر واک آؤٹ کیا تھا۔ مگر قدرت کا عجیب نظام ہے چاہ کن راچاہ درپیش (کنواں کھودنے والے کے سامنے خود کنواں آتا ہے) اس وقت بھارت، امریکہ، برطانیہ نے جمہوری حکومت سے کیوں احتجاج نہیں کیا کہ یہ عدالتیں غلط ہیں اور انہی عدالتوں سے کئی افراد پھانسی بھی پاچکے ہیں۔ اگر نواز شریف کے دور میں یہ عدالتیں سزائے موت دیں تو جمہوری موت ہوگی اور فوجی دور میں سزائے موت کو ہم کیا نام دینگے اگر عوام کا نمائندہ سزا موت پائے تو مجرم گردانا جائے اور جب بات وزیراعظم اور ان کے ساتھیوں کے آئے تو دنیا واویلا کرے۔ کہاں تھے وہ مغربی اور بھارتی میڈیا والے، جب دھڑا دھڑ نواز شریف کے دور میں ایم کیو ایم اور دوسرے ملزمان سزائے موت پارہے تھے۔ بھارتی زی ٹی وی بڑی بے غیرتی کے ساتھ کہہ رہا تھا کہ یہ کیسا انصاف ہے کہ ایک ملزم کو عمر قید اور اس کے ساتھیوں کو معاف کردیا جائے۔ وہ اپنی ہی عدالت سے کل کا فیصلہ بھول گیا کہ خود بھارتی عدالت نے لالو پرشاد کو تو گرفتار کرکے جیل بھیج دیا۔ اور اس کرپشن کے مقدمے میں ان کی بیوی رابڑی دیوی کی ضمانت منظور کرلی۔ سینکڑوں بھارتی عدالتوں میں ایسی ہزاروں مثالیں ملیں گی کہ ملزم کے ساتھی بری ہوجاتے

ہیں اور صرف ایک دو ملزموں کو سزا ہوتی ہے یہ کام عدالتوں کا ہے

زی ٹی وی یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اب اس فیصلے کے بعد پاکستان کی معیشت خراب ہوجائے گی۔ اسٹاک مارکیٹ گر جائے گی۔ جس وقت یہ تبصرہ ہورہا تھا تو اسی زی ٹی وی چینل میں نیچے اس کے اپنے ملک کی اسٹاک مارکیٹ کی پٹی چل رہی تھی۔ میں نے جب اس کے اعداد جمع کیے تو معلوم ہوا کہ خود بھارتی اسٹاک ایکسچینج میں مندی کا رجحان تھا۔ سو خصوصی بڑی بڑی کمپنیوں میں سے 85 کمپنیوں کے شیئرز گر رہے تھے۔ اور صرف 13 کمپنیوں کے شیئرز معمولی سے بڑھے ہوئے تھے۔ دو شیئرز برابر تھے۔ ہمارے پاکستانی ٹیلی ویژن کے تینوں چینل روایتی طور پر خاموش تھے۔ ان کو زی ٹی وی کا جواب دینا تو کجا اس کیس کی لحہ بہ لحہ معلومات عوام تک پہنچانا بھی گوارا نہیں تھا ہمیں نواز شریف کی سزا کا علم زی ٹی وی، سی این این اور بی بی سی کی خصوصی نشریات سے ہوا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ قوم سیاست دانوں سے مایوس اور بیزار ہوچکی ہے۔ کیونکہ کسی نے بھی اس کے مسائل حل نہیں کیے۔ عوام کو ان سیاست دانوں سے نہ کوئی ہمدردی ہے اور نہ ہی وہ ان سے کسی بھلے کی توقع رکھتے ہیں اس لیے اس سزا پر کوئی خاص ردعمل کم از کم پاکستان میں نہیں ہوگا البتہ عالمی برادری میں پھانسی کی صورت ہونے والی بدنامی تو نہیں ہوگی۔ مگر اسکے دوررس نتائج بہرحال ظاہر ہوں گے اور خصوصی طور پر بھارت اس کا پروپیگنڈا بہت کرے گا۔ اگر جنرل مشرف طیارہ کیس کے بجائے نواز شریف دور کے کرپشن کے کیس پہلے سماعت کرواتے تو عوام ان کے اس احتساب کے عمل کو اچھی نگاہ سے دیکھتے اور خوش بھی ہوتے اور کسی کو ہماری طرف انگلی اٹھانے کا موقع بھی نہیں ملتا اور کرپشن کے درجنوں کیس نواز شریف، شہباز شریف، سیف الرحمان اور ان کے ساتھیوں کے خلاف مل جائیں گے آدھا لاہور تو شہباز شریف نے ایل ڈی اے (LDA) کی لوٹ مار میں اپنی طرف کردیا تھا۔ بہت سی تو فائلیں بھی نہیں ملیں گی۔ یہی سب کچھ سیف الرحمان اور انکے بھائی کررہے تھے دونوں ہاتھوں سے لوگوں کو لوٹ رہے تھے۔ راتوں رات سی بی آر کے ایس آر او (SRO) کے ذریعے اربوں روپے کی ڈیوٹیوں میں گھپلا روزمرہ کے واقعات بن چکے تھے۔ موٹروے اور دیگر خریداریوں پر کمیشن معمول تھا۔ یہ سب کام پرائم منسٹر ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے ہورہے تھے۔ اب بھی چھ ماہ میں 250 ارب کے بجائے 15 ارب وصول کرنا کوئی کارنامہ نہیں ہے، لوگ آہستہ آہستہ فوج سے بھی بددل ہورہے ہیں۔ کاروبار ٹھپ ہے اس کا مزید منفی اثر ہوگا۔ نئی صنعتیں اب بالکل نہیں لگ رہی ہیں۔ مزید بے روزگاری بڑھے گی مجموعی طور پر جنرل مشرف کے مشیر صاحبان یا تو ناکام ہورہے ہیں یا پھر ان کو غلط مشوروں سے ناکام بنادیں

کے جمہوریت اگرچہ ہماری ضرورت ہے مگر تمام مچھلیاں ہی تالاب میں گندی نہیں ہوتیں۔ آخر ہم اپنے باغ میں بھی تو انہی درختوں کی چھٹائی کرتے ہیں جو خراب ہو رہے ہوتے ہیں سارے باغ کو تو نہیں اجاڑتے ۔ جمہوریت کی بحالی کے لیے کوئی نہ کوئی فارمولا لانا ہوگا۔ پاکستان کی بقا کے لیے اب پہلے سے زیادہ ضروری ہو گیا ہے کیونکہ چھ ماہ قبل جب فوجی انقلاب آیا تھا تو عوام نے اس کو غنیمت جانا تھا۔ مگر چھ ماہ کی کارکردگی انتہائی غیر تسلی بخش ہے لوئی راہ نکالیں، قبل اس کے کہ عوام ان اندھیروں سے بھی بے زار نہ ہو جائیں اور عالمی سطح پر بھی ہم اکیلے نہ رہ جائیں کیونکہ ہم ایک نئے موڑ پر پھر اکیلے کھڑے ہیں خدا نہ کرے کہ بار بار قوم کو یہ دن دیکھنا پڑے افسوس اس بات کا ہے کہ پچاس سالہ تاریخ میں ایک وزیر اعظم قتل ہوا ایک پھانسی چڑھا۔ ایک جلاوطن ہوا اور آخری جیل میں سڑے گا۔ یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیئے۔ بہت ہو چکی ہماری بدنامی۔ کوئی تو اچھائی ہمارے ملک وقوم کے مقدر میں ہو۔

باقی سب خیریت ہے

حضرت ابراہیمؑ نبوت سے پہلے خدا کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ سورج کو چمکتا ہوا دیکھ کر سمجھتے ہیں یہی میرا خدا ہے مگر رات کو سورج غروب ہو جاتا ہے کہتے ہیں یہ خدا نہیں ہو سکتا پھر رات کو چاند جگمگاتا ہے تو سمجھتے ہیں، ہونا ہو یہی میرا خدا ہوگا مگر صبح چاند چھپ جاتا ہے۔ کہتے ہیں، یہ خدا نہیں ہو سکتا بڑے بڑے درختوں کو خدا سمجھ کر اس کی عبادت شروع کر دیتے ہیں مگر موسم کے تبدیل ہوتے ہی درختوں کو خزاں گھیر لیتی ہے۔ پتے گرتے ہیں اور درخت اجڑ جاتے ہیں۔ کہتے ہیں، یہ بھی خدا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح تلاش جاری رکھتے ہیں اور آخر ایک دن ان کو خدا مل جاتا ہے اس وقت یہی حال ہماری قوم کا ہے۔

انہیں ہر آنے والا اپنا مسیحا لگتا ہے۔ ایوب خان کا مارشل لاء لگا۔ ہم سمجھے کہ یہی ہمارا مسیحا ہے۔ ان سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کر لیں اور سمجھے کہ ایبڈو کا قانون آ گیا ہے اب تمام بدعنوان سیاست دانوں سے جان چھوٹ جائے گی مگر صرف ایک سال کے بعد یہی سیاست دان بھیس بدل کر ایوب خان کے ساتھ مل گئے۔ پھر قوم ایوب خان سے بیزار ہو کر سڑکوں پر آ گئی یحییٰ خان نے قوم کو تسلی دی اور عوام سمجھے یہی ہمارا مسیحا ہے چند سال بعد لوگ اس سے بیزار ہونے لگے پھر جنگ چھڑ گئی ملک آدھا ہو گیا قوم ڈر گئی سیاست دانوں کو پھر فوج سے چھٹکارا ملا۔ اس آدھے ملک پر ذوالفقار علی بھٹو چھا گئے نئے نئے تجربات شروع ہوئے راتوں رات صنعتی ادارے صنعتکاروں سے چھین کر نیشنلائز ڈ کر دیئے گئے۔ یاد رہے ہر جگہ دنیا میں غیر ملکی ادارے قومی تحویل میں لیے جاتے ہیں مگر ہم نے انوکھا فارمولا نکالا غیر ملکی اداروں کو ہاتھ تک نہیں لگایا خود اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار لی نتیجہ یہ نکلا کہ بڑی بڑی صنعتیں حکومت کی تحویل میں جا کر بیمار صنعتیں ہو گئیں۔ نئے نئے لیبر قوانین صنعت کاروں پر لاگو کر دیئے گئے مزدور روٹی کپڑا اور مکان کی آڑ میں فیکٹریوں کے مالکوں سے الجھا دیئے گئے نئی صنعتیں لگنا بند ہو گئیں جب تک پی پی پی کا پہلا دور رہا لوگ نئی صنعتیں لگانے سے دور رہے بلکہ متعدد صنعت

کا رخلیجی ریاستوں میں چلے گئے جہاں نہ کوئی ٹیکس تھا نہ لیبر قوانین کا فتنہ۔ جب صنعتیں بند ہونا شروع ہوئیں تو ہمارا مزدور بھی باہر چلا گیا ہماری معیشت کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ ہمارے پڑوسی ملک میں تو دن رات صنعتوں کا جال پھیل رہا تھا۔ ہم ڈبل روٹی اور مکھن امپورٹ کر رہے تھے۔

قوم پھر بیزار ہوئی کیونکہ سوشلزم کا نعرہ کھوکھلا نکلا۔ مسیحا جسے سمجھا وہ ہی عوام کو روٹی نہ دے سکا مکان تو کجا کپڑا بھی عوام کا اتار لیا گیا ایسی مہنگائی ہوئی کہ عوام کی چیخیں نکل گئیں۔ چار روپے پچہتر پیسے کا ڈالر مارکیٹ میں تین گناہ ہو گیا۔ بھلا چودہ روپے کا ڈالر لے کر ہم عوام کو کیسے سستے داموں روزمرہ کی چیزیں فراہم کر سکتے تھے۔ ایک نیا نعرہ بلند ہوا نظام مصطفے کا۔ لوگ پھر اس کو مسیحا سمجھ کر انہی سیاست دانوں کے پیچھے چل پڑے جلسوں جلوسوں کے بہت سے مقابلے ہوئے گھمسان کی جنگ ہوئی۔ انتخابات میں زبردست دھاندلی نہیں بلکہ بقول شخصے ''دھاندلا'' ہوا۔ عوام بھی سڑکوں پر آ گئے تھے۔ پھر مارشل لاء لگا ہم پھر ضیاء الحق کو مسیحا سمجھ کر ان کے پیچھے چل پڑے اسلام آباد سے اسلامائیزیشن کا عمل شروع کیا گیا ٹی وی سے پردہ اور اسلام اسلام کا ورد شروع کیا گیا۔ گانے بجانے ختم کر دیے گئے طبلہ سارنگی غلافوں میں لپیٹ دیے گئے مگر عوام کا مسئلہ حل کرنے کے لیے کوئی ٹھوس اقدامات نہیں کیئے گئے۔ عوام غریب سے غریب تر اور امیر امیر سے امیر تر ہوتے گئے ضیاء الحق نے فوج کے ساتھ ساتھ علماء، سیاست دانوں کو ساتھ ملا کر گیارہ سال تک عوام کو بیوقوف بنایا۔ پھر ایک دن وہی ہوا جہاز پھٹا۔ ضیاء الحق اللہ کو پیارے ہو گئے۔ پھر الیکشن ہوئے وہی سیاست دان میدان میں آ گئے۔ 1988ء سے 12 اکتوبر تک عوام کو ٹیبل ٹینس کی بال کی طرح ایک کورٹ سے دوسرے کورٹ میں پھینکتے رہے۔ پھر ایک زبردست دھماکہ ہوا اب کے جہاز پھٹا نہیں صحیح سلامت زمین پر اتر آیا لوگوں نے سکون کا سانس لیا کیونکہ جمہوریت ہمیں راس ہی نہیں آتی فوج نے ایک بار پھر اقتدار سنبھالا۔ ہر طرف سے خوش آمدید کا غلغلہ بلند ہوا قوم نے لٹیروں اور سیاست دانوں سے جان چھوٹنے پر ایک مرتبہ پھر سکون کا سانس لیا اتنی بڑی تمہید لکھنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہماری قوم 52 سال سے ایک کے بعد ایک مسیحاؤں سے مایوس ہو چکی ہے، اور دھوکہ کھا چکی ہے اب جنرل پرویز مشرف صاحب کی طرف بھی چھ ماہ کا حساب جمع ہو گیا ہے۔ قوم نے جنرل کا استقبال اسی امید پر کیا تھا کہ یہ ہمارے زخموں پر مرہم رکھیں گے۔ ہمارے مسائل حل کریں گے۔ مگر چھ ماہ میں عوام کے مسائل جوں کے توں ہیں۔ وہی سڑکیں ٹوٹی پھوٹی ہیں۔ بجلی اسی طرح جا رہی ہے۔ اسی طرح پانی کا ناغہ ہوتا ہے سرکاری دفتروں میں البتہ حاضریاں بڑھ گئی ہیں۔ مگر رشوت کے بغیر کام کرنے کا تصور اب بھی نہیں ہے۔ شروع شروع میں سرکاری ملازمین فوج کے ڈر سے رشوت لینے میں جھجکتے ضرور تھے۔ مگر اب فوج کا ڈر

بھی آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔ کوئی نئی صنعت نہیں لگ رہی ہے، بینکوں میں اربوں روپیہ بھرا پڑا ہے مگر لوگ اس ڈر سے کہ کہیں صنعت بیٹھ نہ جائے کوئی رسک نہیں لے رہے ہیں سرکاری ملازمین کی چھانٹی شروع ہو گئی ہے ڈوبے ہوئے سرمائے صرف 15 ارب روپیہ وصول ہوا ہے، مہنگائی عروج پر ہے تو ساتھ ساتھ بے روزگاری بھی بڑھ رہی ہے دہشت گردی کی لہر پھر اٹھ رہی ہے ڈکیتیاں دن دہاڑے، گاڑیاں چھیننے کے واقعات اسی طرح عام ہو رہے ہیں عوام کے مسائل حل کرنے کے لیے کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی ہے آئی ایم ایف نے اگر نواز شریف دور کا قرضہ دوبارہ ری شیڈول نہیں کیا تو ہم جون کا قرضہ اور پھر دسمبر کی قسط تو کجا سود بھی ادا کرنے کے قابل نہیں ہوں گے معیشت کا وہی حال ہے کہ ایک دیہاتی نے جس کا باپ بیرون ملک گیا تھا اپنے باپ کو خط لکھا ''ابا جی! اس سال بارش نہیں ہوئی کھیت سوکھ گئے باقی سب خیریت ہے اماں بیماری سے چل بسی باقی سب خیریت ہے گھر میں کھانا پکے دو دن ہو گئے۔ باقی سب خیریت ہے گاؤں میں ہیضہ پھیل گیا جس سے لوگ مر رہے ہیں باقی سب خیریت ہے رقم فوراً بھیجو باقی سب خیریت ہے یہی حال ہمارا ہے ایکسپورٹ کم ہو رہا ہے باقی سب خیریت ہے دن بدن معیشت بیٹھ رہی ہے باقی سب خیریت ہے امریکہ اور بھارت ہمیں دھمکا رہے ہیں باقی سب خیریت، خلیج کے ممالک نے پاکستان سے لیبر ویزا پالیسی ختم کر دی ہے، جس کی وجہ سے سینکڑوں پاکستانی بیروزگار ہو رہے ہیں باقی سب خیریت ہے سیاست دانوں کو اپنے کیئے کی سزا ملنی شروع ہو گئیں باقی سب خیریت ہے میرا کالم بھی ختم ہو رہا ہے باقی سب خیریت ہے خدا کے لیے عوام کے مسائل کے حل کے لیے کوئی اچھا سا پیکیج کا اعلان کیا جائے ورنہ سب یہی کہیں گے باقی سب خیریت ہے۔

دواسازی کی صنعت کا بحران

کذشتہ چھ سال سے دواؤں کی عدم دستیابی اور قیمتوں میں اضافے سے عوام کے مسائل بڑھ رہے ہیں مگر اس چھ سالہ دور جس میں تین سال پاکستان پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ کی حکومتیں رہیں آج تک اس مسئلہ کے حل کی کوئی کوشش تو کجا Debate بھی نہیں کی گئی۔ ضیاء الحق کے دور میں دواؤں کی قیمتوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اوّل جان بچانے والی ادویات یعنی انتہائی حساس دوائیں مثلاً اینٹی بائیوٹک، ٹی بی، جگر، کینسر دل اور انسولین وغیرہ کی قیمتوں پر حکومت کا کنٹرول تھا بغیر پیشگی اجازت کے دام نہیں بڑھائے جاسکتے تھے۔ دیگر ادویات اس کنٹرول سے آزاد تھیں۔ مگر حکومت اس پر بھی نظر رکھتی تھی۔ غیر ملکی کمپنیوں کے نرخ مقامی دواساز کمپنیوں سے 25 سے 50 فیصد تک عموماً زیادہ ہوتے تھے مگر مقامی کمپنیوں کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ جب چاہیں غیر ملکی کمپنیوں کی قیمتیں جنہیں (Leader Price) کہا جاتا تھا اس کے برابر کر سکتے ہیں گو کہ وہ ایسا نہیں کرتے تھے کیونکہ چھ سال قبل تک ہر سال 6% از خود بڑھانے کا اختیار دواساز اداروں کو حاصل تھا مگر عوام اور ایک خاص طبقہ کے شور وغل کی وجہ سے حکومت نے یہ اختیار اپنے پاس رکھ لیا اور جب بھی ادویات کی قیمتوں کے بڑھانے کی بات چلتی ہے عوام میں شور شروع ہو جاتا ہے۔

یہاں میں وضاحت کرتا چلوں کہ ہمارے ملک میں تین کٹگریز ہیں ایک ملٹی نیشنل یعنی غیر ملکی ادارے جن کا مارکیٹ میں روپیوں کی صورت میں 45% حصہ ہے اور وہ نئی ایجادات اور پرانی ایجادات کے بل بوتے پر من مانی قیمتیں فکس (مقرر) کروالیتے ہیں۔ جب ان کے Patent یعنی اجارہ داری کا وقت ختم ہوتا ہے تب جا کر کوئی اور کمپنی وہ دوا بنا سکتی ہے اس دوران وہ دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں کیونکہ ان کا کوئی مد مقابل (Competitor) نہیں ہوتا اور حکومت بھی اس دوا کی قیمت کا تعین نہیں کر سکتی لہٰذا ہماری وزارت صحت مجبوراً ان کی من مانی قیمت دے دیتی ہے مگر آٹھ سال اور کہیں دس سال بعد ان کا Patent ختم ہوتا ہے، تب

پتہ چلتا ہے کہ مارکیٹ میں اصل خام مال کتنے کا تھا پھر ملکی دواساز ادارے اس دوا کو رجسٹرڈ کروا کر آدھی سے بھی کم قیمت میں مارکیٹ کرتے ہیں مگر ہمارے ڈاکٹر صاحبان کے قلم پر تو پہلی کمپنی کا نام چڑھا ہوتا ہے۔ وہ اکثر اسی پرانی کمپنی کی دوا لکھتا ہے اس طرح مراہا تھی بھی لاکھ ٹکے کا، کی مثال صادق آتی ہے اس کمپنی کو پھر بھی بڑا حصہ ملتا رہتا ہے اور وہ کمپنی ہمیشہ فائدہ میں رہتی ہے اس دوران وہ اس خام مال میں کچھ تبدیلی کر کے ایک نئی دوا بنا لیتے ہیں اور اس کو الگ نام سے جدید تحقیقات (Latest Research) بتا کر پھر رجسٹرڈ کروا لیتے ہیں اور پھر من مانی شروع ہو جاتی ہے تمام غیر ملکی کمپنیاں 52 سال سے ہمارے ملک میں یہ کھیل کھیل رہی ہیں۔ ان غیر ممالک کی سرپرستی خود ان کے اپنے ملک کے سفیر کر رہے ہیں۔ صرف ایک مرتبہ 1973 میں پیپلز پارٹی کی حکومت نے اس اجارہ داری کو ختم کر کے جنرک ایکٹ بنایا مگر ان کمپنیوں کی مزاحمت اور سفیروں کی مداخلت سے اس قانون کو صرف تین سال کے اندر اندر ہی ختم کر کے 1976ء میں ڈرگ ایکٹ نافذ کر دیا گیا اس دن سے آج تک غیر ملکی کمپنیوں کی اجارہ داری قائم ہے یہ آپس میں کوئی Competition نہیں کرتے اور آئے دن کسی نہ کسی دوا کی مصنوعی قلت پیدا کر کے حکومت پر دام بڑھانے کا دباؤ ڈالتے ہیں۔ دوسری کیٹیگریز میں ملکی کمپنیاں آتی ہیں جن کا قومی سیل میں اب 45 فیصد تک حصہ بن چکا ہے مگر ہم تعداد دیکھیں تو مال کی مقدار 60 فیصد سے بھی بڑھ چکی ہے کیونکہ ایک تو وزارت صحت نے ان کی کم دام کی رجسٹریشن کر رکھی ہے دوسرے ان میں آپس میں اتنا کمپیٹیشن (مقابلہ) تھا کہ اگر مارکیٹ لیڈر کی قیمت -/60 ہوتی تو یہ 45 روپے میں بیچ رہے ہوتے۔ پھر آہستہ آہستہ ڈالروں کی قیمت بڑھ جانے سے اس کو ایڈجسٹ (Adjust) کرتے رہتے تھے۔ مگر چھ سال سے قیمتیں منجمد ہیں۔ اور وزارت صحت نے ان کی قیمتوں کو ہی آخری قیمت مان کر لیڈر پرائس (LeaderPrice) تک ان کے لیے ممنوع کر دی ہے یعنی اگر وہ 40 روپے میں رضا کارانہ طور پر بیچ رہا تھا اور مارکیٹ لیڈر -/60 فکس تھی تو اب وہ اپنی قیمت نہیں بڑھا سکتا اس وجہ سے یا تو وہ دوا بنانا بند کرے یا پھر بلیک مارکیٹ میں فروخت کرے جو ایک مقامی ادارہ ہرگز نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے وہ ادارے جنھوں نے عوام کے مفاد میں رضا کارانہ طور پر اپنے دام کم رکھے تھے۔ آج اس قانون کے ہاتھوں پریشان ہیں ان مقامی اداروں کو ڈاکٹروں کی اکثریت ان کی کم قیمت میں وہی اعلیٰ معیار کی وجہ سے پسند کرتی ہے مگر بڑے بڑے سرجن حضرات صرف غیر ملکی کمپنیوں کو پسند کرتے ہیں۔ مگر یہ بات طے ہے کہ وہ اپنے کلینک میں 90 فیصد انہی پاکستانی کمپنیوں کی دوائیں Dispense کرتے ہیں۔

تیسری کیٹگری میں بنی بنائی غیر ملکی ادویات آتی ہیں۔ اگرچہ اس کا حجم (Volume) 10 فیصد ہے اس

دس فیصد پر بھی اربوں روپے کا زرمبادلہ ضائع کر کے ہم نہ تو ملکی کمپنیوں کو فائدہ پہنچا رہے ہیں نہ غیر ملکی کمپنیاں جو پاکستان میں مال بنا رہی ہیں ان کو کوئی نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ یہ صریحاً غیر ضروری ہے۔ ہم 98 فیصد ادویات یہاں بنا رہے ہیں۔ صرف دو فیصد ادویات ہم بنا سکتے ہیں۔ مگر غیر ملکی کمپنیاں اپنی اجارہ داری کا بھرم رکھنے کے لیے یہ دو فیصد دوائیں اپنے غیر ملکی ہیڈ کوارٹرز سے امپورٹ کر کے مارکیٹ کرتی ہیں کہ غیر ملکی ادویات پر 10 فیصد ٹیکس نافذ ہے، مگر یہی مال کوئی مقامی یا غیر ملکی ادارہ خام مال امپورٹ کرتا ہے تو اسے 10 فیصد سے لے کر 25 فیصد تک امپورٹ ڈیوٹی ادا کرنی پڑتی ہے اور اسی دواسازی میں استعمال ہونے والا Excipient یعنی غیر فعال اجزاء پر 45 فیصد ڈیوٹی اور سیلز ٹیکس بھی ادا کرنا پڑتا ہے یہی نہیں اس کے پیکنگ میٹریل، یعنی بوتل، بکس بورڈ، کیپل بلسٹر، خالی کیپسول بوتلوں کے کیپ 45 فیصد ڈیوٹی 15 فیصد سیلز ٹیکس ادا کر کے ہی استعمال میں لائے جاتے ہیں یعنی اگر ہم یہی مال Finished حالت میں امپورٹ کریں تو اس میں استعمال میں آنے والی بوتل کیپ، بکس بورڈ لیبل، بلسٹر اسٹرپ، خالی کیپسول ہر چینی گلوکوز سارا بی ٹول الغرض کسی بھی چیز پر باہر سے لانے پر کوئی ڈیوٹی، سیلز ٹیکس نہیں ہے صرف 10 فیصد کے حساب سے پیک دوا پر ڈیوٹی ہوگی۔ اس کڑے وقت میں جبکہ ہم ورلڈ بینک، آئی ایم ایف کے مقروض ہیں اربوں روپے زرمبادلہ بچا سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ ساری ادویات پاکستان میں بن رہی ہیں۔ اب تو ان کی رجسٹریشن عام ہے، ہم بنگلہ دیش، خلیج، سری لنکا، یونان تک سے امپورٹ کر رہے ہیں جہاں دواسازی کے ادارے ہم سے بھی بہت پیچھے ہیں ہماری وزارت صحت کا کوئی نمائندہ جا کر ان کی فیکٹریوں کا معائنہ نہیں کرتا۔ جبکہ پاکستانی کمپنیوں کے تو سال میں کئی کئی معائنے ہوتے ہیں آخری مرتبہ 1992 میں نرخوں میں اضافہ ہوا تھا۔ اس وقت ڈالر 20 روپے کا تھا آج ڈالر 55 ہے کوئی بتائے کہ دس سال میں بجلی گیس مزدوروں کی تنخواہیں کہاں سے کہاں پہنچ گئیں بے شک غیر ملکی کمپنیاں پہلے ہی اس کا مارجن رکھ کر دام رجسٹرڈ کروا چکی ہیں مگر وہ پاکستانی کمپنیاں کیا کریں۔ جنہوں نے ازخود اپنے دام کم رکھے ہیں۔ ان کو کس بات کی سزا دی جا رہی ہے۔ کم از کم ان کے داموں کو تو اگر چہ نہ بڑھائیں مگر Leader Price جو غیر ملکی کمپنیوں کو حاصل ہے وہ تو دے دیں۔ کیا کوئی بھی باشعور پاکستانی 1992 کی قیمت پر کوئی چیز حاصل کر سکتا ہے کیا آٹا، دال، گھی، دودھ، گوشت، مکھن، سبزی، فروٹ، پانی، گیس، بجلی، پیٹرول روزمرہ کی ضرورت نہیں ہے ان پر کیوں کنٹرول نافذ نہیں ہے۔ وہ عوام نہیں کیا فرشتے کھاتے ہیں۔ دواؤں کے دام بڑھانے کی بات آئی ہے تو سب کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سب شور مچاتے ہیں جن کمپنیوں کے دام زیادہ ہیں۔ انہیں تو کم کرتے نہیں مگر جن کے دام پہلے سے ہی کم

ہیں۔ اگر ہم ان کے دام بڑھانے کی بات کریں تو بھی کوئی سننے کو تیار نہیں ہوتا بالکل اس لطیفے کی طرح ''ایک جاہل پولیس والا ایک شخص کو پکڑ نے اس کے گھر گیا۔ اس شخص نے اپنے مکان سے باہر آ کر اپنی گرفتاری کی وجہ پوچھی تو پولیس والے نہ کہا کہ تم پر الزام ہے کہ تم کمیونسٹ ہو۔ اس نے کہا بھئی میں کمیونسٹ نہیں بلکہ اینٹی کمیونسٹ ہوں۔ پولیس والا بولا: مگر پھر بھی ہوئے تو تم کمیونسٹ ہی خاندان سے۔ چلو گاڑی میں بیٹھو'' کیونکہ دام بڑھانے کی بات آئے گی تو یہ کوئی نہیں دیکھ رہا کہ پاکستانی ادارے پہلے ہی کم منافع پر کم دام پر دوائیں فروخت کر رہے ہیں۔ اس کی شاباش دینے والا کوئی نہیں ہے نہ امپورٹ پر زرمبادلہ ضائع ہونے سے بچانے والا کوئی آگے آتا ہے جو کل درآمد کا 5% بھی نہیں ہے۔

ایمنسٹی (Amnesty) اسکیم کو سادہ اور آسان بنایئے

موجودہ حکومت نے چند ماہ قبل ٹیکس ایمنسٹی اسکیم نافذ کی جس کی رو سے جو دولت یا جائیداد ابھی تک کسی وجہ سے چھپائی گئی ہو، وہ 30 اپریل 2000ء تک ظاہر کر کے اس پر 10 فیصد کے حساب سے ٹیکس جمع کروا کر وہائٹ (White) کی جاسکتی ہے اور پھر اس کو اپنے مصرف میں لایا جاسکتا ہے اس قسم کی اسکیمیں ماضی میں لائی جاتی رہی ہیں۔ مگر حکومت اس اسکیم کو نافذ کرنے سے پہلے اگر تاجر برادری ٹیکس کنسلٹنٹس (Tax Consultants) چیمبرز کے نمائندوں سے صلاح مشورہ کر لیتی تو اس کے منفی اور مثبت پہلو سامنے آجاتے ۔مگر ہم نے کبھی مشاورت کرنا سیکھا ہی نہیں ہے، میں اس اسکیم کے چند منفی پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں سب سے پہلے تو یہ اسکیم خاموشی سے نافذ العمل ہے گذشتہ چند ماہ گزرنے کے باوجود اس کی اخبارات یا ٹیلی ویژن سے کوئی تشہیر نہیں کی گئی۔ چند انکم ٹیکس کے افسران ازرائے مہربانی خود چند مارکیٹیوں میں گئے اور اس کے فوائد بتا کر آگئے اس اسکیم میں چند خامیوں کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے وہ یہ کہ اس اسکیم کے تحت اگر کسی نے اپنی چھپی ہوئی دولت ظاہر کی اور اگر انکم ٹیکس کا افسر پھر بھی مطمئن نہیں ہوا تو وہ اس عام معافی یعنی 10 فیصد ٹیکس بھرنے کے باوجود اس اسکیم سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور وہ عام معافی اس کے گلے پڑ جائے گی گویا 10 فیصد رقم بھی گئی اور بقایا 90 فیصد بھی کھٹائی میں پڑ جائیگا اور اس پر مزید طرہ یہ کہ اس فیصلے کے خلاف کوئی اپیل بھی نہیں سنی جائے گی۔ اس سے ٹیکس گزار کا بنیادی حق بھی چھین لیا گیا ہے جو بین الاقوامی اصولوں سے انحراف کے منافی ہے آپ کسی سے اس کا یہ بنیادی حق نہیں چھین سکتے اور نہ ہی یہ طریقہ مناسب ہے کہ آپ 10 فیصد لینے کے باوجود اس کو کچھ نہیں دیں اس کی وضاحت ہ، ت ضروری ہے اور اس کو واپس لینے میں ہی حکومت اور تاجر برادری دونوں کا بھلا ہے گزشتہ سال اسی قسم کی اسکیم بھارت میں بھی نافذ کی گئی تھی اور ایک ماہ تک اس کو پبلسٹی کے ذریعے بھارتی انکم ٹیکس کے ارکان نے عوامی شعور کو بیدار کیا اور اربوں روپے وصول کر کے

کالے دھن کو سفید دھن میں تبدیل کر دیا جس کی وجہ سے بھارتی معیشت میں زبردست تبدیلی محسوس کی گئی۔ یہ اسکیم بالکل سادہ سی تھی کہ آپ اپنا کالا دھن ظاہر کریں اس پر ٹیکس جمع کرائیں وہ ٹیکس کی رسید ہی کافی ہے۔

آپ سے نہ کوئی سوال نہ کوئی جواب، حکومت کو اس کا حصہ مل گیا۔ آپ کو آپ کا پیسہ مبارک۔ نہ کوئی ڈر نہ کوئی خوف، نہ کوئی دھونس۔ اگر اس اسکیم کو ہم نے بھی کامیابی سے ہمکنار کرنا ہے تو صرف ایک نکتے (Point) پر عمل کیجئے کہ ادھر 10 فیصد جمع ہوا۔ ادھر وہ دولت آپکی ہوگئی کمال تو یہ ہے کہ ٹیکس ادا کرنے والا تو خود رضا کارانہ طور پر بتا رہا ہے کہ میں نے یہ رقم خود ظاہر کی ہے اس کی کسی نے بھی نشاندہی نہیں کی ہے دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس کی تاریخ کی توسیع ہونی چاہیے کیونکہ اس اسکیم کے اعلان کے تقریباً ڈیڑھ ماہ تک تو خود انکم ٹیکس کے دفاتر میں نہ تو کوئی فارم دستیاب تھے اور نہ ہی کسی بھی قسم کی تشہیر کی گئی تھی تاجر برادری ٹیکس کنسلٹنٹس صاحبان ڈیڑھ ماہ تک بے چینی سے انکم ٹیکس کے دفاتر کے چکر لگاتے رہے ان کو یہی جواب ملتا رہا کہ اسلام آباد سے ابھی تک اس کا نوٹیفیکیشن تک نہیں آیا۔ کسی کو بھی اس کی خبر نہیں تھی پھر اچانک ایک دن اخباری خبروں سے معلوم ہوا کہ یہ اسکیم نافذ کر دی گئی ہے۔ پھر کئی دن تک اس کی تفصیلات بھی میسر نہیں تھیں بہر حال جو ہوا سو ہوا ۔اب اس کو بہتر بنانے پر توجہ دینی چاہیے۔ اور اس کی تاریخ 30 جون تک بڑھا دینی چاہیے یہاں یہ بات بھی بتانا ضروری ہے کہ ہم کو یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ ہماری تاجر برادری ٹیکس دینا چاہتی ہے۔ مگر کیا وجہ ہے کہ ٹیکس کے دائرہ میں نہیں آتی اس کی نمایاں وجوہات یہ ہیں کہ ایک تو ہمارے ملک میں ٹیکس کی شرح بہت زیادہ ہے۔ عام زندگی میں جب دو پارٹنرز (Partners) کاروبار شروع کرتے ہیں تو دونوں پارٹنرز سرمایہ اگر برابر لگاتے ہیں اور ساتھ ساتھ وقت بھی برابر کا دیتے ہیں تب جا کر آدھے آدھے یعنی پچاس فیصد منافع کے حقدار ہوتے ہیں اسی طرح وہ نقصانات کی صورت میں بھی پچاس فیصد نقصان کے ذمہ دار ہوتے ہیں جبکہ ہمارے ملک میں بلاواسطہ (Direct) اور بالواسطہ (Indirect) ٹیکس کی شرح 45 فیصد ہوتی ہے، یعنی نہ سرمایہ لگایا نہ نقصان کا حصہ دیا اور آمدنی سے 45 فیصد لے لینا زیادتی نہیں تو اور کیا ہے دنیا میں تین ممالک رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے بھی بہت چھوٹے ہیں یعنی سنگاپور ہانگ کانگ اور سوئیٹزرلینڈ، مگر ان ممالک میں کاروبار اور ٹیکس سب سے زیادہ وصول ہوتا ہے کیونکہ وہاں انکم ٹیکس صرف 15 فیصد ہے۔ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی کمپنی اپنا دفتر ان تینوں میں سے کم از کم کسی ایک ملک میں ضرور کھولتی ہے اور اب تو بہت سی کمپنیوں کے ہیڈ آفس بھی انہی ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ جبکہ بنگلہ دیش، ہندوستان اور پاکستان کی آبادی 150 کروڑ ہے جبکہ ان تینوں ملکوں کی آبادی صرف ڈیڑھ کروڑ ہے یعنی ایک فیصد آبادی والے ممالک کھربوں ڈالر ٹیکس وصول کرتے ہیں اور وہاں

ساری بنیادی سہولتیں موجود ہیں۔ دنیا کے نقشہ میں ان ملکوں کا وجود صرف ایک نقطہ سے ظاہر کیا جاتا ہے جبکہ برصغیر کے تینوں ممالک نقشے میں بہت نمایاں ہیں مگر ہم اپنے نظام کے ہاتھوں خود تباہ ہو رہے ہیں۔ انگریزوں نے جب ہندوستان میں ستر سال پہلے یہ نظام نافذ کیا تھا تو ٹیکس ادا کرنے والوں کے لیے بڑے بڑے فائدے رکھے تھے اور ہندوستان ان کی نوآبادی والے ممالک میں سے تھا جبکہ ہم آزاد ہیں۔ انکم ٹیکس اور دیگر ٹیکس وصول کرنے والے زیادہ تر انہیں ٹیکس گزاروں کے پاس جاتے ہیں اور تمام بوجھ انہی پر ڈال دیتے ہیں پھر اتنا ٹیکس ادا کر کے ہمیں حکومت کیا سہولتیں فراہم کر رہی ہے جن ممالک میں ٹیکس زیادہ وصول کیا جاتا ہے تو وہاں تمام بنیادی سہولتیں بھی موجود ہیں سڑکیں، پارک، تعلیم، اسپتال تو ہیں ہی اگر کوئی بیروزگار ہو جائے تو اس کو بیروزگاری الاؤنس ملتا ہے وہاں انکم ٹیکس کے دفتر کوئی نہیں جانتا صرف اس کا وکیل جو لکھ کر بھیج دے گا وہی قابل قبول ہوگا۔ کیسا سوال' کیسا جواب۔ کیا آج تک ہمارے ملک میں ایک اسسیمنٹ (Assesiment) جوں کا توں مانا گیا ہے اگر آپ قوم کو ٹیکس کے دائرے کار میں لانا چاہتے ہیں تو دھونس اور دھمکا کر نہیں لا سکتے۔ اختیارات ختم کیجئے۔ آسان طریقہ کار اپنایئے اور ٹیکس کی شرح بھی 10 فیصد کر دیجئے جب آج آپ خود 10 فیصد کالے دھن کو سفید کرنا چاہتے ہیں تو کل بھی اسی شرح سے انکم ٹیکس وصول کیجئے یقین جانیئے۔ ہماری تاجر برادری اپنے ملک کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔ مگر خدارا اب ڈنڈے کا استعمال کرنے کے بجائے آسانیاں پیدا کر کے ٹیکس وصول کیجئے۔ تاجروں کے نمائندوں کو اعتماد میں لے کر اس اسکیم کو قابل عمل بنا کر ہی اس کو کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس اسکیم کے دائرہ کار کو سرکاری ملازمین ریٹائرڈ اور حاضر فوجی افسران تک وسیع کر دیا جائے۔ تاکہ وہ بھی اپنے کالے دھن کو سفید کرا سکیں۔ کیونکہ ان کے پاس بھی اربوں روپے کالے دھن کی صورت میں موجود ہیں۔ ایک ہی وقت میں دونوں اسکیمیں تاریخ کی تجدید کے بعد سب پر ایک ساتھ لاگو کر دی جائیں اور جو ضروری نقائص جن کی نشاندہی کی گئی ہے ان کو دور کر دیا جائے فوجی حکمرانوں کو چاہیے کہ تاجر برادری کے مسئلے پر غور وخوص کر کے اعتماد کی فضاء پیدا کریں۔ اور سروے ٹیموں میں پولیس اور انتظامیہ کے دیگر اہلکار، فوج اور رینجرز پر مشتمل دستے نہ بنائے جائیں ورنہ اگر تاجر حضرات ہڑتال پر اتر آئے تو اس سے حکومت کی بدنامی بھی ہوگی اور کاروبار جو پہلے ہی سے ٹھپ ہے اور مندی کا رجحان پایا جاتا ہے اس میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ اتنے بڑے اقدامات کرنے سے پہلے عوام کو مراعات وترجیحات سے اور مذاکرات کی میز پر لا کر اس مسئلے کو حل کریں۔

بے حسی

پچھلے ہفتے میں نے ایمنسٹی اسکیم کے جن غلط نکات کی نشاندہی اپنے کالم میں کی تھی وزیر خزانہ جناب شوکت عزیز صاحب نے پہلی مرتبہ حکومتی سطح پر صنعت کاروں کے ساتھ بیٹھ کر نہ صرف ان کے مطالبات مانے بلکہ آئندہ بجٹ میں مزید مراعات کا بھی اعلان کیا۔ جس سے صنعت کار اور تاجر برادری میں حکومت کی مثبت پالیسی کی وجہ سے کچھ سکون پیدا ہو رہا ہے خدا کرے یہ سکون دیرپا ثابت ہو دوسری مثبت پیش رفت ہمارے وزیر داخلہ جناب معین الدین حیدر صاحب نے کی اور اسمگلنگ کی روک تھام کے سلسلے میں اس پیشہ سے منسلک تاجروں کے نمائندوں سے مذاکرات کر کے اس کاروبار کو ختم کرنے والا فارمولا بھی طے کر لیا میری دعا ہے کہ وہ اس محاذ پر بھی کامیاب ہوں اور افغان ٹریڈ کے بہانے اسمگلنگ کا یہ کاروبار ختم ہو سکے۔ وزیر داخلہ کا علماء کرام سے پہلی مرتبہ رابطہ فرقہ رارانہ فسادات کے خاتمے کے لیے قوم کی نگاہ میں ایک احسن اقدام ثابت ہوگا جس کی آج بہت ضرورت ہے کیونکہ پاکستان میں بسنے والے مسلمان آپس میں دست وگریباں ہونے سے بچ جائیں گے بے گناہ مسلمان آئے دن ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کی بھینٹ نہیں چڑھیں گے اور کشیدہ فضا ختم ہوگی۔

میں وزیر داخلہ کی توجہ امن وامان کی صورت حال کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ جو پورے ملک بالخصوص کراچی میں نہایت سنگین صورت اختیار کر چکی ہے دھشت گردی کے واقعات پھر ابھر رہے ہیں اور اب تو تھانے بھی محفوظ نہیں۔ اتفاق سے کل میں اپنے Cordless ٹیلیفون سے بات کر رہا تھا تو بیچ میں دو تھانوں کے وائرلیس سیٹ کا رابطہ میری لائن سے ہو گیا بڑی دلچسپ گفتگو سننے کو ملی۔ ایک ہیڈ کوارٹر کا وائرلیس والا ایک تھانے سے پوچھ رہا تھا کہ اس کے تھانے کی حفاظت کے لیے کتنی نفری کافی رہے گی ایک جانب یہ حال ہے دوسری طرف کراچی میں دوسرے صوبوں سے جرائم پیشہ افراد کے گروہ داخل ہو رہے ہیں اور روزانہ

آٹھ تا دس ڈکیتی کی وارداتیں کر کے لدے پھندے اپنے علاقوں کو لوٹ جاتے ہیں انہیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں 200 سے زائد وارداتیں ہر ماہ ہوتی ہیں جن میں سے ایک دو وارداتوں کا سراغ مل پاتا ہے کاریں اور موٹر سائیکلوں کے چھیننے والی مافیا کا شہر میں زبردست نیٹ ورک موجود ہے اور ظاہر ہے ایسے کام بغیر سرکاری اہلکاروں کی سرپرستی اور تعاون کے نہیں ہو سکتے اس پر فوری توجہ کی ضرورت ہے ہم کو اکیسویں صدی کے تقاضوں کے مطابق پولیس کے نظام کو بدلنا ہوگا جب تک کرپٹ پولیس افسروں کی چھانٹی نہیں ہوتی اور پڑھے لکھے ایماندار افسران نہیں آتے ڈکیتیاں بڑھتی رہیں گی۔ایک زمانہ تھا جب تھانے عوام کے تحفظ اور خدمت کے مراکز ہوتے تھے اب تو یہ نت نئے جرائم کی آماجگاہ بن چکے ہیں اس سلسلے میں پولیس کو بہت مطعون کیا جاتا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ ان کا بھی اتنا قصور نہیں پولیس کی تنخواہیں اس قدر کم ہیں کہ وہ حلال کی کمائی سے اپنی اور اپنے بال بچوں کی بنیادی ضروریات تک پوری نہیں کر سکتے اس پر مستزاد ان کی طویل اور سخت ڈیوٹی یہ عوامل پولیس اہلکاروں کو چڑچڑا، بدمزاج اور بے رحم بنا دینے میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں اور حالات کا شکار پولیس اہلکار ایک جانب اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے رشوت لینے پر مجبور ہوتا ہے تو دوسری طرف عوام سے ناروا سلوک اور موقع ملے تو ان ظلم توڑنے کو بھی اپنا حق سمجھنے لگتا ہے ضرورت ہے کہ ان کے اختیارات اور تنخواہ میں توازن قائم کیا جائے تاکہ وہ خود کو حاصل اختیارات کا ناجائز استعمال کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کریں دنیا بھر میں سب سے زیادہ تنخواہ عدلیہ اور پولیس کے عملے کی ہوتی ہے، جبکہ ہمارے ہاں دونوں ہی کی تنخواہیں سب سے کم ہیں دنیا میں پولیس کے اختیارات قانون کے تابع ہوتے ہیں وہ عوام کے ٹیکس پر پلتے اور انہی کو جوابدہ ہوتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں عوام پولیس کو جوابدہ ہوتے ہیں آج پولیس پر عوام کے عدم اطمینان کا حال یہ ہے کہ اکثر ڈکیتیاں اور دیگر جرائم رجسٹرڈ ہی نہیں کرائے جاتے کیونکہ پولیس اہلکار خود گھر کے افراد پر شک کر کے لوگوں کو تنگ کرتے ہیں۔لوگوں کو یقین ہو چلا ہے کہ رپورٹ کرائی جائے تب بھی انہیں کچھ حاصل نہ ہوگا مال برآمد بھی ہو جائے تو پولیس خود ہضم کر لیتی ہے مدعی کو صرف تھانے اور عدالت کے چکر لگوائے جائیں گے۔پھر مجرموں کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ پکڑے جائیں تو کس میں ہمت ہے کہ ان کے خلاف گواہی دے کیونکہ گواہی دینے والے جانتے ہیں کہ اگر ان کی گواہی پر مجرموں کو سزا ہو بھی جائے تو جب وہ سزا بھگت کر واپس آئیں گے تو اس کا بدلہ لے لیں گے یا اس سے پہلے ان کے ساتھی ہی بدلہ چکا دیں گے۔عوام کو تحفظ دینے والا تو کوئی ہے ہی نہیں عوام اس صورت حال کے عادی ہو چکے ہیں۔بالکل اس لطیفہ کی طرح ''ایک بادشاہ نے اپنے وزیر سے کہا کہ میرے عوام بہت سکون سے رہ رہے ہیں مزے کر رہے ہیں ان کو کیسے تنگ

کیا جائے اس نے کہا کہ ہر شہری کے شہر کے اندر آنے پر ٹیکس لگا دیا جائے۔چنانچہ ہر آنے والے پر ٹیکس لگا دیا گیا۔لوگ خاموشی سے آتے اور ٹیکس دیتے رہے بادشاہ نے پھر وزیر کو طلب کیا کہ یہ تو بڑی آسانی سے ٹیکس دے رہے ہیں۔وزیر نے کہا کہ ایسا کریں آنے اور جانے دونوں پر ٹیکس لگا دیں تو یہ ضرور پریشان ہوں گے لہٰذا اب آنے جانے دونوں پر ٹیکس لگا دیا گیا لوگ آنے اور جانے پر بھی ٹیکس دینے لگے کسی نے کوئی شور نہیں مچایا۔بادشاہ نے پھر وزیر کو طلب کیا۔وزیر نے کہا ایک کمرہ بنائیں اور ہر آنے جانے والے کو اس کمرے میں بلا کر ٹیکس لیں اور ایک جوتا بھی ماریں لوگ آتے گئے ٹیکس بھی دیتے رہے اور جوتا بھی کھاتے گئے مگر کسی نے بھی اس ظلم کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کیا اس پر بادشاہ نے لوگوں کو جمع کر کے مجمع سے سوال کیا۔ان کو اگر کوئی تکلیف ہے تو بتائیں سارا مجمع خاموش رہا صرف ایک آدمی اٹھا اور کہا: بادشاہ سلامت کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ کمرا بڑا بنا دیا جائے کیونکہ اندر آنے اور باہر جانے والا راستہ بہت تنگ ہے جس سے کافی وقت ضائع ہوتا ہے اگر کمرہ بڑا ہوگا تو بندہ جلد فارغ ہو سکے گا۔یہی حال ہمارے عوام کا ہو چکا ہے کہ وہ ڈاکوؤں سے کہتے ہیں کہ بھائی یہ لو مال اور جلدی جاؤ کیونکہ ہمیں اور بھی کام نبٹانے ہیں۔اگر کسی پڑوسی کو بھی معلوم ہو جائے کہ برابر میں ڈاکو آئے ہیں تو وہ بھی مدد کے لیے نہیں آتے بلکہ اپنے گھر کے دروازے بند کر کے ٹی وی دیکھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں ایسی بے حسی کا کیا انجام ہوگا اللہ خیر کرے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے غلط نظام کو مغربی طرز کے جدید نظام سے بدلیں عوام جو افواج پاکستان سے بہت زیادہ توقع لگائے بیٹھے ہیں اب مایوسی کا شکار ہوتے جا رہے ہیں کیونکہ اب وہ سیاست دانوں کے نظام میں اور فوجی نظام میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ان کی تکالیف کو کون دور کرے گا؟

ہمارا تعلیمی نظام

آج کل صوبہ سندھ کی وزارت تعلیم مختلف اسکولوں مونٹیسر یز' اقراء سمیت تمام انسٹی ٹیوشن کا سروے اور رجسٹریشن کروانے میں مصروف ہیں بے حد افسوس ہوتا ہے کہ 52 سال قبل ہندوستان اور پاکستان ایک ساتھ آزاد ہوئے آج ہندوستان تعلیمی میدان اور جدید ٹیکنالوجی میں ہم سے بہت آگے ہے بھارت کے بعض صوبوں میں تعلیمی شرح 90 فیصد تک پہنچ چکا ہے جبکہ ہم شہروں میں صرف 15 فیصد اور پورے پاکستان میں صرف 8 فیصد کی شرح تعلیم رکھتے ہیں 1972ء میں جب پی پی پی کی حکومت تھی ۔تمام اسکول کالج یونیورسٹیاں قومیا لئے گئے جس کی وجہ سے ہمارا تعلیمی معیار بری طرح متاثر ہوا۔سرکاری اساتذہ اس تندہی اور خلوص سے نہیں پڑھا سکے جس طرح وہ پرائیوٹ اداروں میں پڑھاتے تھے بڑے صنعت کاروں اور مخیّر حضرات کے قائم کردہ بڑے بڑے تعلیمی ادارے اپنا معیار کھو بیٹھے یہ بڑا بھیانک تجربہ تھا جو ہمارے بچوں کا مستقبل تباہ کرنے کے لیے کیا گیا تھا ہمارے طالب علم تعلیم سے دور ہوتے گئے اور اسلحہ' منشیات اسکولوں اور کالجوں میں عام ہوتی گئی ۔کسی نے بھی اس کی روک تھام نہیں کی سیاست دانوں نے طالب علموں کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا دوسری طرف ہمارے اساتذہ نے کالجوں اور اسکولوں میں پڑھانے کا دھیان چھوڑ کر گھر گھر پرائیوٹ ٹیوشن کا سلسلہ شروع کر دیا۔جو طالب علم ان سے پرائیوٹ پڑھتا وہ پاس ہو جاتا جو نہیں پڑھتا اس پر وہ کلاس روم میں بھی توجہ نہیں دیتے اور پھر ان کو اپنے مضامین میں فیل کر دیتے تھے ہمارے اسکولوں اور کالجوں کی ڈگریاں جو ایک زمانے میں معیاری سمجھی جاتی تھیں خلیج کے ممالک تک کے لیے نا قابل قبول ہوگئیں ۔کہاں تو وہ اپنے بچوں کو پڑھنے کے لیے پاکستان بھیجتے تھے کہاں وہ پاکستان کی ڈگریاں ہی تسلیم نہیں کرتے تھے تعلیمی معیار کی تباہی کا سبب یہ تھا کہ رشوت دے کر آپ کوئی بھی امتحان پاس کر سکتے تھے حتی کہ میڈیکل کالج میں سالانہ امتحانات میں نقل اور رشوت دے کر پاس ہونے کا فیشن شروع ہو گیا مگر ہمارے

پڑوسی ملک بھارت نے تعلیم کے میدان میں اپنی کرفت مضبوط رکھی اور تعلیمی معیار نہیں گرنے دیا پھر ضیاء الحق کی حکومت آئی اس نے ان بڑے بڑے اسکولوں کالجوں کو ان کے اصلی وارثوں کو واپس کرنا شروع کر دیا یہ نیشنلائزیشن کی نحوست جس کی وجہ سے 15 سال تک ایک بھی اسکول کالج نہیں بن سکا طالب علم بینچوں اور کرسیوں کے بجائے ٹاٹ اور دریوں پر بیٹھ کر پڑھنے لگے کیونکہ سرکاری انتظام میں چلے جانے کے بعد تعلیمی اداروں میں فرنیچر کے ٹوٹ پھوٹ جانے کے بعد نئے فرنیچر کے لیے حکومت کے پاس کوئی فنڈ نہیں تھا۔ پرائیوٹ اسکولوں میں اساتذہ کی تنخواہیں زیادہ تھیں اور عمارت اور فرنیچر مناسب ہوتا تھا۔اس لیے یہاں تعلیم کا معیار سرکاری اسکولوں اور کالجوں سے کہیں بہتر ہوتا تھا پھر مختلف کمیونیٹیز کے مخیّر حضرات نئے نئے اسکول کھولتے گئے ۔بڑے بڑے ادارے آگئے آئے انہوں نے فیس تو بے شک زیادہ رکھی مگر تعلیم کے گرتے ہوئے معیار کو نہ صرف روکا بلکہ ہمارے طالب علموں کو تعلیم کی طرف دوبارہ لانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔صوبہ پنجاب میں تو بین الاقوامی معیار کی درسگاہیں عوامی سطح پر بنائی گئیں آج بھی جن کا معیار سندھ' بلوچستان اور سرحد سے کہیں بہتر ہے پرائیوٹ درسگاہوں کی شکل میں ہر محلّہ میں ان کا نیٹ ورک قائم کیا جدید کمپیوٹر لائبریریاں کتابیں وافر مقدار میں دوبارہ ان کی زینت بنیں جبکہ سرکاری انتظام میں چلنے والے تمام اسکول' کالج' یونیورسٹیاں علاوہ چند ایک کے سب بین الاقوامی معیار سے کہیں کم ہیں۔اول تو کمپیوٹر اور جدید لیبارٹیز نہیں ہوتیں اگر کہیں ہیں تو وہ خراب پڑی ہیں۔کتابوں سے لدے پھندے طالب علم صرف آنے جانے میں خرچ ہو جاتے ہیں۔

کم از کم پرائیوٹ اسکولوں میں تعلیمی معیار اور ماحول مع جدید کمپیوٹر اور لیبارٹریوں کے بہتر ہے پھر حکومت نے پوری قوم سے 4 فیصد اقراء ٹیکس کے نام سے وصول کیا جو آج بھی ٹیکس میں شامل کر کے وصول کیا جا رہا ہے کھربوں روپے اس میں جمع ہوئے مگر تعلیمی صورت حال ذرا بھی بہتر نہیں ہو سکی 15 سال میں کتنے نئے اسکول کھولے گئے کتنی نئی یونیورسٹیاں اور کالج بنے کہاں گیا یہ تعلیمی اقراء سرچارج سے وصول ہونے والا روپیہ۔اس کا قوم کو حساب کیوں نہیں دیا جاتا؟ اور صرف صوبہ سندھ میں رجسٹریشن اور سروے کا نظام شروع کرنے کا کیا مقصد ہے ایک طرف تو حکومت قوم سے اقراء سرچارج وصول کرے (یاد رہے محکمہ کسٹم تمام درآمد پر 4 فیصد اقراء سرچارج کے نام پر وصول کرتا تھا۔یہ ٹیکس وزیر خزانہ محبوب الحق کے دور میں لگایا گیا جو میں دوسرے ٹیکسوں میں ملا دیا گیا) پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں تدریسی کتابوں، لیبارٹریوں' سوفٹ ویئر کمپیوٹر کی درآمد پر ڈیوٹی وصول کی جاتی ہے جبکہ ہمارے پڑوسی ملک نے دنیا میں امریکہ کے بعد سب سے بڑی

سوفٹ ویئر ایکوئیمنٹ (Software Equipment) بنانے کا کارنامہ انجام دیا۔ایک ہم ہیں کہ ان کے کمپیوٹرز اور سائنسی آلات پر ڈیوٹی وصول کر رہے ہیں ہماری وزارت تعلیم کو چاہیئے کہ نئے نئے اسکول کالج یونیورسٹیاں بنانے پر خصوصی توجہ دے یا پھر پرائیوٹ اداروں کی اس سلسلہ میں سرپرستی کرے ۔غریب بچوں کے لیے اسکالرشپ پر پرائیوٹ درسگاہوں میں ایک کوٹہ مقرر کرے تا کہ ہمارے مستقبل کے یہ سپوت دنیا کے آگے شرمندہ نہ ہوں اور بھارت سے پیچھے نہ رہیں تعلیم صرف نام لکھنے اور پڑھنے کا نام نہیں کسی قوم کے مستقبل کا اندازہ لگانے کے لیے اس ملک کے تعلیمی معیار اور نظام کو دیکھیئے جس قدر اچھا تعلیمی نظام ہوگا اس قوم کا مستقبل اسی قدر تابناک ہوگا ۔اب وقت ہے ہماری فوجی حکومت کو سب سے پہلے تعلیمی میدان میں انقلابی تبدیلیاں لانی چاہیں گھسے گھسائے مضامین نکال کر اکیسویں صدی کا تعلیمی نظام' جدید ٹیکنالوجی کو متعارف کروانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے جدید نظام اور ٹیکنالوجی کی درآمد پر تمام ٹیکس ختم ہونے چاہیں پرانے Equipments کو تبدیل کرنے کے لیے اگر اب بھی ہم نے فرائض ادا نہیں کئے اور فرسودہ نظام تعلیم جاری رکھا تو یہ نئے نئے اسکول کالج بند ہونے سے سب زیادہ فائدہ بھارت کو ہوگا وہ چاہتا ہے کہ پاکستانی جاہل رہیں ۔ایک چھوٹے سے پڑوسی ملک سری لنکا میں تعلیمی شرح 97 فیصد ہے جو صنعتی اعتبار سے ہم سے بہت پیچھے ہے لہٰذا ہم کو چاہیے کہ ہم اپنی صنعتیں سری لنکا میں لگا کر ان کا تعلیمی نظام اپنے ملک میں درآمد کریں یہ Excahange دونوں ممالک کی ترقی کی راہ میں سنگ میل ثابت ہوگا۔

ٹیکس کلچر ضروری ہے مگر؟

چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف صاحب نے ایک پرہجوم پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ وہ تین سال میں اقتدار سول حکومت کے حوالے کر دیں گے ساتھ ساتھ یہ بھی اعلان کیا کہ ٹیکس سروے ہر حال میں 27 مئی سے شروع کر دیا جائے گا۔ جی ایس ٹی پر کوئی مفاہمت نہیں ہوگی اور یہ ٹیکس بھی نافذ العمل رہے گا اس کے علاوہ سی بی آر کے 1000 نااہل اور بدعنوان ملازموں کو فارغ کر دیئے جانے کا اہم اعلان بھی انہوں نے کیا نئے نئے ٹیکسوں کے بجائے ٹیکس دہندگان کے دائرے کو وسعت دینا قابل ستائش اقدام ہے خاص طور پر جب موجودہ حکومت کو ماضی کی حکومتوں کے لیے ہوئے قرضے اتارنے ہیں اور ان پر سود بھی ادا کرنا ہے جبکہ حکومت خود دیوالیہ ہونے کو ہے تو ہم سب کا فرض بنتا ہے کہ حکومت کا ساتھ دیں۔تاجر تنظیمیں بار بار یقین دہانی کرا چکی ہیں کہ وہ ٹیکس دینا چاہتی ہیں مگر اس راہ کی رکاوٹیں دور کی جانی چاہئیں خصوصی اختیارات ختم کیے جائیں اور ٹیکس کی شرح کم سے کم کی جائے ۔لہٰذا میری رائے میں حکومت کو چاہیئے کہ تاجر برادری کے عہدیداران پر مشتمل ایک کمیٹی بنائے جو سرکاری ذمہ داروں کے ساتھ افہام تفہیم کی فضاء میں جنرل صاحب کے اس وعدے پر کہ ''ہم کسی پر ظلم نہیں ہونے دیں گے اور پرانے ٹیکس دہندگان پر مزید بار نہیں ڈالیں گے'' نیک نیتی سے عملدرآمد کو یقینی بنایا جائے حکومت نے ایک طرف تو ایمنسٹی اسکیم میں 15 جون تک توسیع کر دی ہے لہٰذا وزیر داخلہ جناب معین الدین حیدر کو چاہیے کہ ٹیکس سروے 15 جون کے بعد ہی شروع کرائیں کیونکہ جو تاجر اس اسکیم سے فائدہ نہ اٹھائیں ان کو 15 جون کے بعد ہی پکڑا جا سکتا ہے ورنہ ایک طرف سروے دوسری طرف ایمنسٹی اسکیم' دونوں باہم متصادم ہوں گی اس وقت تاجر برادری میں خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔حکومت وقت کی ذمہ داری ہے کہ وہ خوف کی اس فضاء کو ختم کرے مہنگائی اور بے روزگاری کا دور دورہ ہے کاروبار ٹھپ ہو چکا ہے 8 ماہ سے کوئی نیا کارخانہ نہیں لگا البتہ بندش اور نیلامی زوروں پر ہے اسٹاک ایکسچینج جو پہلی بار موجودہ

حکومت کے آنے کے بعد 2000 سے تجاوز کر چکا تھا آج 1600 سے بھی نیچے آچکا ہے اور روزانہ 25 سے 50 پوائنٹ کمی ہو رہی ہے ایسے میں ہوش مندی کا ثبوت دینا چاہیے۔ میں جناب ارشاد احمد حقانی صاحب کی اس بات سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں کہ جنرل صاحب کو اپنے لیئے نہیں بلکہ ملک کے لیے ٹیکس کی ضرورت ہے۔ لہذا ہم کو دل کھول کر اس اسکیم میں حصہ لینا اور حکومت کو ٹیکس دینا چاہیئے اور جنرل صاحب کے ہاتھ مضبوط کرنا چاہئیں۔ پہلی مرتبہ کسی حکومت نے کہا کہ ہم آپ کے ٹیکس کا پورا پورا حساب دیں گے اس حکومت کے آنے کے بعد کم از کم ماضی کی حکومتوں کی طرح روزانہ کروڑوں کا سرکاری ہیر پھیر تو رک گیا ہے۔ وزراء کی دن رات کی کرپشن کا تو خاتمہ ہوا۔ جنرل صاحب کی تین گھنٹے کی پریس کانفرنس ماضی کی حکومتوں کے بدترین کرپشن کا منہ بولتا ثبوت تھی جس سے انہوں نے بڑی مہارت سے اخباری نمائندوں کو نہ صرف آگاہ کیا بلکہ کافی حد تک مطمئن بھی کیا مگر اکیلے جنرل صاحب کس کس محاذ پر لڑیں گے۔ انہیں اچھی سیاسی' سماجی شہرت کے حامل محبّ وطن افراد پر مشتمل ایک ٹیم مشاورت کے لئے ترتیب دینی چاہئے۔ میری رائے میں صرف 13 شہروں تک سروے کافی نہیں ہے۔ سب سے زیادہ کرپٹ بڑے بڑے زمیندار' جاگیردار' سیاست دان ہیں جو آج بھی اپنے اپنے گاؤں میں آرام فرما رہے ہیں۔ ان پر کوئی ٹیکس نافذ نہیں ہوتا۔ وہ ہر سال اپنی زمینیں بڑھانے گاؤں کے جگت چوہدری کہلوانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کو اس سروے اسکیم سے بھی دور رکھا گیا ہے ہر حکومت میں یہ جاگیردار شامل رہے ہیں بلکہ ہماری قومی اسمبلی میں تو اکثریت انہی کی ہوتی ہے کیونکہ 80 فیصد پاکستان کی آبادی گاؤں گوٹھوں پر مشتمل ہے کبھی ایک چوہدری جیتتا ہے تو کبھی دوسرا یعنی اقتدار کی جنگ چوہدریوں کے مابین ہی لڑی جاتی ہے جیتنے والا یعنی صاحب اقتدار بھی چوہدری ہوتا ہے اور ہارنے والا صاحب اختلاف بھی چوہدری ہوتا ہے جب تک ہم اس نظام کو نہیں بدلیں گے۔ انہی چوہدریوں کے محتاج رہیں گے۔ ہمارے پڑوسی ملک بھارت نے بڑے بڑے زمینداروں' جاگیرداروں سے زمین کی ایک حد مقرر کر کے نجات حاصل کر لی تھی آج ان کی لوک سبھا (پارلیمنٹ) میں شاذ و نادر کوئی جاگیردار یا وڈیرہ آتا ہے مگر ہمارے ہاں تو اکثریت کل بھی آج بھی ان ہی سے بھری تھی اور بھری رہے گی۔ جب تک ہم زمینوں کی حد مقرر نہیں کرتے۔ پڑھے لکھے محبّ وطن افراد انتخاب نہ لڑ سکتے ہیں اور نہ جیت سکتے ہیں۔

آخر میں اس بات کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ ٹیکس ضرور وصول کریں مگر خوف و ہراس کی فضاء ختم کر کے اور اعتماد کی فضاء بحال کر کے اسی طرح ہم بہتر نتائج حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ ہمارے تاجر بھی محبّ وطن پاکستانی ہیں۔ مغربی ممالک کی طرح ٹیکس وصول کرنے کا آسان اور سادہ نظام ہی ہمارے معاشرے کی اصلاح کر سکتا

ہے۔ ٹیکسوں کا بوجھ ہی کرپشن کی دعوت دیتا ہے اس کو روکنا بہت ضروری ہے اور فوج کو اس میں کم سے کم ملوث کرنا ہی عقلمندی ہے۔ عجیب ستم ظریفی ہے یا تو پچاس سال سے کوئی سروے کے لئے نہیں آیا' آج ٹولیوں کی شکل میں تمام محکمے ایک ساتھ یلغار کر رہے ہیں۔ اللہ خیر کرے۔

یہ مسائل کون حل کرے گا؟

جب سے میں نے کالم لکھنا شروع کیا اس دو سال کے عرصے میں روزنامہ ''جنگ'' کی معرفت اور ڈائریکٹ بھی کافی خطوط ملتے رہے جس میں چھوٹی چھوٹی مشکلات کا ذکر ہوتا تھا۔ بہت سے نجی معاملات پر مشتمل شکایات' تجاویز ہوتی تھیں کچھ خطوط میں میرے کالموں کی تعریف اور تنقید ہوتی تھی اس لئے میں نے اپنے کالموں میں ذکر نہیں کیا۔ مگر چند ہفتوں سے مجھے ایسے خطوط ملے جن میں سنگین عوامی مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے تو میں نے مناسب جانا کہ ان قارئین کی خواہشوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے مسائل کا ذکر اپنے کالم میں کروں تاکہ متعلقہ ادارے اس کا سدباب کریں۔

پہلا خط کراچی سے ایک سینئر سیٹزن ڈاکٹر ایس۔ کے۔ بنگش صاحب نے لکھا ہے۔ جناب بنگش لکھتے ہیں:
سابق وزیراعظم نواز شریف صاحب کے دور کے آخری دنوں میں خود نواز شریف صاحب نے بزرگ شہریوں کے لئے جن کی عمریں 65 سال سے تجاوز کر جائیں' حکومت کی طرف سے ایک پیکج کا اعلان کیا تھا جس کی رو سے ان بزرگ شہریوں کو ہوائی اور ریلوے کے سفر میں اور سرکاری ٹرانسپورٹ میں 50 فیصد تک رعایت دی جانی تھی ساتھ ساتھ یوٹیلٹی بلز یعنی گیس' بجلی' ٹیلی فون' یوٹیلٹی اسٹورز سے خریداری پر 10 سے 20 فیصد تک رعایت' 2000 روپے کے کوپن پر خصوصی ڈسکاؤنٹ' اسپیشل کارڈز کا اجراء جن کے ذریعے مفت عجائب گھروں اور لائبریریوں میں آنے جانے کی سہولتیں' گیس' بجلی' ٹیلی فون کے ترجیحی کنکشن مفت علاج معالجہ کی سہولتیں وغیرہ وغیرہ شامل تھیں اس کی تمام قومی اخبارات اور ٹی وی کے ذریعے خاصی تشہیر کی گئی تھی۔ جس سے ہمارے بزرگ شہری بڑے خوش ہوئے تھے کہ 52 سال بعد کسی کو ان کے حقوق کا خیال آیا تھا اور اس جانب عملی اقدام کا وعدہ کیا گیا تھا۔ وہ امید لگائے آج تک اس اسکیم کی بحالی کے لئے بے چین ہیں (مغربی ممالک میں ایسی مراعات 60 سال سے زائد افراد کو ان کے ریٹائرڈ ہونے پر خود بخود حاصل ہو جاتی ہیں)۔

جناب بنگش کا خط واقعی مفلوک الحال بزرگ شہریوں کی روزمرہ تکالیف اور مسائل سے بھرا ہوا ہے۔ خصوصاً اپنے سگے رشتہ داروں کا اس عمر میں بے کار سمجھ کر نظر انداز کرنا (بعض بدبخت تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ بڈھا مرتا بھی نہیں ہے) سوہان روح ہے۔

حکومت وقت کو واقعی ان کی مدد کرنی چاہئے۔ مغرب کی طرح بوڑھوں کے لئے دارالامان (اولڈ ہاؤس) کا قیام اس سلسلے میں مفید ہوسکتا ہے جہاں ان بزرگوں کی مکمل دیکھ بھال اور تمام بنیادی سہولتیں فراہم کرنی چاہئیں۔ اس کار خیر میں این۔ جی۔ اوز کو بھی آگے آنا چاہئے۔

دوسرا خط ایک بیروزگار گریجویٹ لڑکی نے لکھا ہے۔ بڑا دردانگیز بھی ہے اور باعث عبرت بھی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ وہ اور اس جیسی سینکڑوں بے شمار بے روزگار لڑکیاں جب نوکری کے اشتہارات کے حوالے سے انٹرویو کے لئے جاتی ہیں تو ان سے نجی قسم کے سوالات کر کے غلط ترغیبات کبھی اشارتاً اور کبھی براہ راست مطالبات کی شکل میں دی جاتی ہیں۔ میرا قلم ان ترغیبات کو لکھنے کا حامل نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ سب کی عزت محفوظ رکھے۔ یہ حادثات اس کی کئی سہیلیوں کے ساتھ بھی پیش آتے رہتے ہیں۔ یہ بچیاں سات مہینوں سے بیروزگار ہیں اور پریشانی کے عالم میں ایک مرتبہ تو انہوں نے خودکشی کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔ میرے خیال میں ایسی بچیوں کو جنہیں اس قسم کے واقعات سے سابقہ پیش آئے انہیں اسے چھپانے کے بجائے ویمن پولیس اسٹیشن جا کر کسی بھی سینئر پولیس افسر سے مل کر اس ادارے یا افراد کے خلاف ضرور کارروائی کرنی چاہئے تاکہ دیگر افراد آئندہ ایسی شرمناک حرکت نہ کر سکیں۔

ایسا ہی ایک خط مظلوم بیگ نے لکھا ہے۔ انہوں نے اپنا پتہ نہیں لکھا' مگر بہت سنگین مسئلہ کی طرف جائز نشاندہی کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اس ملک میں تمام بڑے بڑے شہروں میں جعلی ریکروٹنگ کمپنیاں کھلی ہیں جو بڑے بڑے دعووں کے اشتہارات چھپوا کر بیرون ملک بھیجنے کا لالچ دے کر غریب اور سادہ لوح بے روزگاروں کو دن دہاڑے لوٹ رہی ہیں۔ بہت سے افراد فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہیں اور ایڈوانس ٹکٹ و ویزے اور دیگر اخراجات کے نام پر لاکھوں روپے جمع کر کے فرار ہو جاتے ہیں۔ پولیس بھی ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتی۔ بعض جعلی کمپنیاں پولیس اور ایف آئی اے کی مدد سے جعلی ویزوں اور فوٹو چینج جس کو عرف عام میں پی سی کہا جاتا ہے' کے ذریعے چار سے پانچ لاکھ روپے لے کر لوگوں کو بیرون ملک بھیج دیتی ہیں اور جب یہ پی سی والا شخص وہاں پکڑا جاتا ہے تو اسے واپس کر دیا جاتا ہے۔ مگر یہاں وہی ایف آئی اے کا عملہ اس کو گرفتار کر کے جو بقایا رقم بچ جاتی ہے' ہتھیا کر ہی چھوڑتا ہے آج تک ان جعلی ریکروٹنگ اور ٹریول ایجنٹوں کے

خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی کیونکہ یہ بڑا سود مند کاروبار ہے جو بارہ مہینے پولیس' ایف آئی اے کے تعاون سے پھل پھول رہا ہے میرے خیال میں متعلقہ حکام کو خصوصی توجہ دینی چاہئے اور اس بے چارے سادہ لوح بیروزگار کی بھرپور مدد کرنی چاہئے۔ جس کا سرمایہ بھی لٹ چکا ہو۔ جعلی ریکروٹنگ کمپنیوں اور ٹریول ایجنٹوں کے خلاف بھرپور کارروائی کر کے اس مذموم دھندے کا سدباب کرنا چاہئے۔

کراچی کے عبدالواحد بلوانی نے بھی ملک بھر کی اسٹاک ایکسچینج کمپنیوں کے خلاف اعداد وشمار کے ساتھ لکھا ہے کہ 90 فیصد کمپنیاں عوامی سرمایہ کھا چکی ہیں اور خود کو دیوالیہ قرار دلوا کر دیگر ناموں سے پھر نئی کمپنیاں بنا لیتی ہیں۔ یہ سلسلہ 20 برس سے جاری ہے۔ ان میں مضاربہ اور ٹیکسٹائل کے شعبے پیش پیش ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ 682 کمپنیوں نے آج تک کوئی ڈویڈنڈ نہیں دیا اور ان کا 10 روپے کا شیئر 50 پیسے تک آ چکا ہے۔ پھر یہ نام بدل بدل کر اپنے اپنے نوکروں رشتہ داروں کے نام سے دوبارہ اسٹاک ایکسچینج میں ممبر بن جاتی ہیں۔ اس میں اسٹاک ایکسچینج کے بروکر بھی شامل ہیں۔ جب چاہتے ہیں کسی بھی شیئر کے دام جعلی خریداروں کے ذریعے بڑھا دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں گرا دیتے ہیں یہ کاروبار بھی ان غریب سرمایہ کاروں کا زندگی بھر کا بچا کھچا سرمایہ ڈبو چکا ہے مگر آج تک کسی محکمے نے ان سے باز پرس نہیں کی کہ یہ اربوں کھربوں کا سرمایہ کہاں گیا۔ انہوں نے ان متاثرین کی کمیٹی بھی بنائی ہے۔

میرے خیال میں حکومت جہاں بینکوں کے نادہندگان سے نمٹ رہی ہے' اسی سختی سے اس کو ان ڈیفالٹروں کو بھی پکڑنا چاہیئے۔ ان سے بھی اربوں روپے ان غریبوں کے وصول ہو سکتے ہیں تو کیوں نہ نیب (NAB) از خود اس کا نوٹس لے ان اسٹاک ایکسچینج کے متاثرین کو کم از کم ان کی اصل رقم لوٹانے کا اہتمام کرے۔ یہ بھی حکومت کا قومی سرمایہ اور فریضہ ہے۔ کیونکہ رعایا کے جان اور مال دونوں کی حفاظت حکومت کے فرائض میں شامل ہے۔ آخر میں تاجروں کی ہڑتال کو آج مسلسل پانچواں دن ہے 52 سال کی تاریخ میں آج تک مسلسل کوئی بھی ہڑتال تین دن سے زیادہ شٹر ڈاؤن نہیں کرا سکی۔ اس ہڑتال کا تسلسل ملک وقوم کے لئے اب خطرناک موڑ پر آنے کو ہے۔

600 پوائنٹ اسٹاک ایکسچینج کا گرنا اور مارکیٹ سے ڈالروں کا غائب ہونا معیشت کی تباہی کی نشاندہی کر رہا ہے۔ سیاسی اور بالخصوص مسلم لیگ اور پی پی پی کے حلقوں میں اس سے خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے ان کا کہنا ہے کہ تاجروں کی ناراضگی اور زبردستی فارم بھروانے سے لوگ فوجی حکومت سے متنفر ہو رہے ہیں اور ہمارا کام آسان ہو رہا ہے تو دوسری طرف بیوروکریسی بھی اس معاملہ کو الجھانا چاہتی ہے کیونکہ ہزاروں افراد کی راتوں

رات چھانٹی کا ردعمل بھی ہو سکتا ہے تاجر برادری ٹیکس تو دینا چاہتی ہے مگر اس کی وصولی کے پیچیدہ نظام سے وہ مطمئن نہیں ہے ان کا یہ مطالبہ بھی جائز لگتا ہے کہ جو بارہ لاکھ افراد اور ادارے پہلے ہی سے ٹیکس دیتے چلے آ رہے ہیں ان کا اس سروے سے کیا واسطہ۔ اس کو پکڑو جو آج تک ٹیکس نہیں دے رہا ہے۔ ان کی اس بات میں وزن ہے اور جو چند ہزار فارم تقسیم بھی ہوئے ہیں وہ انہی لوگوں کو دیئے گئے ہیں جو ٹیکس پہلے ہی سے دے رہے ہیں۔

حکومت کو چاہئے کہ اس ہڑتال کا ہر صورت میں تاجر نمائندوں کی جائز تجاویز کی روشنی میں حل نکالے اس ہڑتال سے نہ صرف عوام کو مشکلات کا سامنا ہے بلکہ خود حکومت کا ریونیو مزید گر جائے گا اس میں دھونس خوف دھاندلی سے اجتناب کر کے تاجروں کے نمائندوں سے مذاکرات کے ذریعے ہر صورت میں کوئی حل نکالنا ہی عقلمندی ہوگی۔